وَاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا (الحدیث)

المُهِمَّاتُ

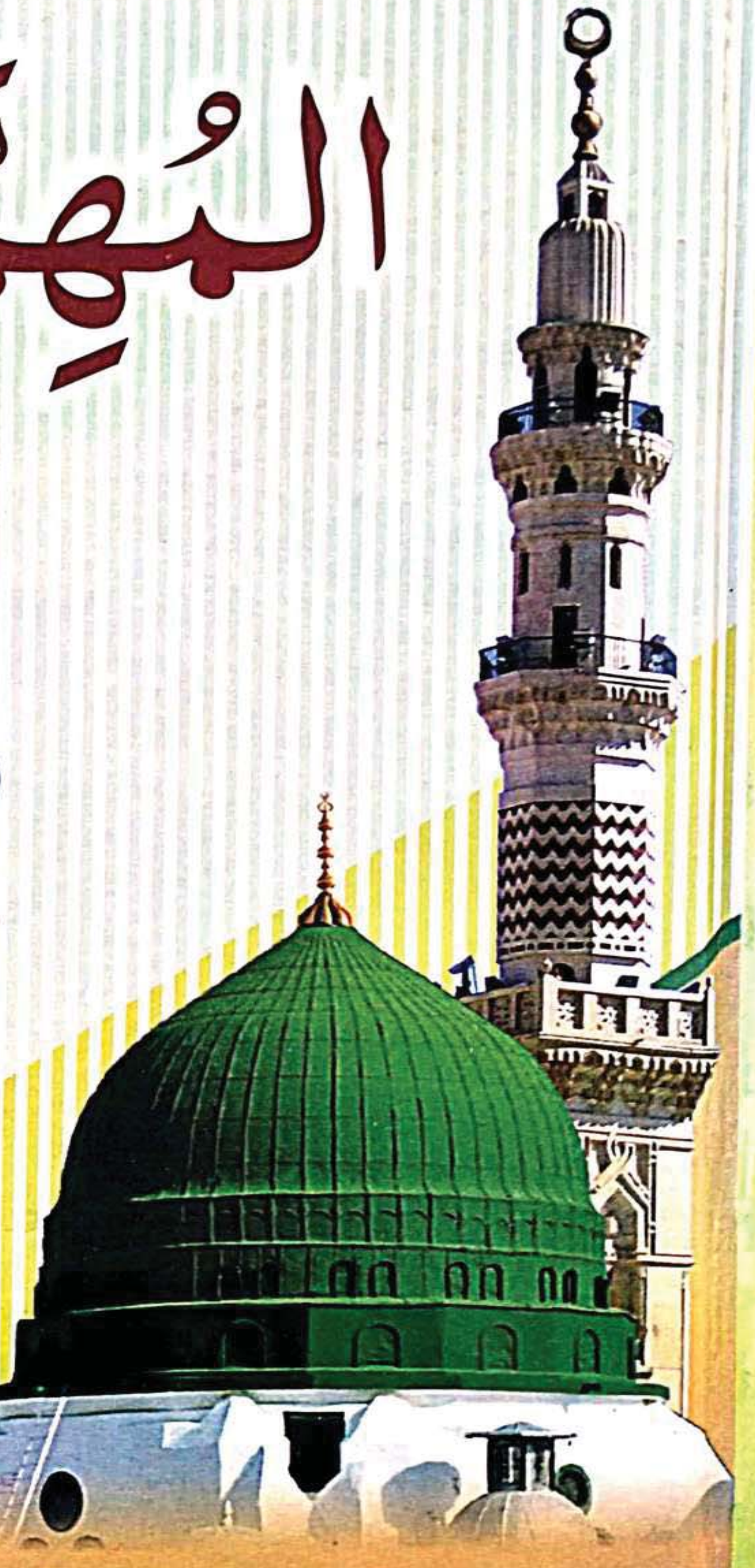
خطبات

شیخ الحدیث والتفسیر، جامع المنقولات والمعقولات

حضرت مولانا قاضی حمید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مہتمم مظاہر العلوم وانوار العلوم شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ

سابقہ ممبر نیشنل اسمبلی پاکستان



ادارہ تالیفات حمیدیہ

فیروز والا روڈ گوجرانوالہ۔ پاکستان

وَإِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا (الحدیث)

المهمات

خطبات

شیخ الحدیث والتفسیر، جامع المنقولات والمعقولات

حضرت مولانا قاضی حمید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مہتمم مظاہر العلوم وانوار العلوم شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ

ممبر قومی اسمبلی پاکستان

ادارہ تالیفاتِ حمیدیہ

فیروز والا روڈ۔ گوجرانوالہ

پاکستان رابطہ نمبر:0300-6492193

نام کتاب .... المہمات

خطبات .... شیخ الحدیث والتفسیر، جامع المعقولات والمنقولات
حضرت مولانا قاضی حمید اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب وتصحیح .... مولانا کفایت اللہ عفی عنہ

طباعت .... باراول۔ فروری 2016

کمپوزنگ .... اسعد نفیس آرٹ 0321-6403547

قیمت ....

ناشر:

ادارہ تالیفاتِ حمیدیہ

گوجرانوالہ - پاکستان رابطہ نمبر:0300-6492193

ملنے کا پتہ:

مظاہر العلوم وانوار العلوم شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ

آئینہ کتاب

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

ترجمہ: اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں سب کے سب قلم ہوں اور سمندر کا تمام پانی سیاہی ہو اور اس کے بعد سات سمندر اور سیاہی ہو جائیں تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔ بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

ترجمہ: بیشک اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبرؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ مومنو! تم بھی پیغمبر علیہ السلام پر درود اور سلام بھیجو۔

انتساب

☆ اپنے محبّ ومحبوبؒ اور مشفق ومحسن استاد عارف باللہ حضرت شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد داؤد احمد صاحب مہتمم مدرسہ انوار العلوم شیخ الحدیث جامعہ مظاہر العلوم گوجرانوالہ کے نام جن کی توجہات عالیہ اور پر فیض صحبتوں کو اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے ہزاروں افراد کی ہدایت و اصلاح تذکیر آخرت اور دینی مزاج میں پختگی پیدا کرنے کا ذریعہ بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ آں موصوف کا سایہ شفقت و عاطفت تا دیر صحت و عافیت کے ساتھ قائم رکھے اور آپ کی عنایتوں کا بہتر سے بہتر بدلہ دارین میں عطا فرمائے۔ آمین

☆ اپنے مخدوم ومکرم والد معظم شیخ الحدیث، شیخ التفسیر، جامع المعقولات والمنقولات حضرت مولانا قاضی حمید اللہ خان صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے نام...... جو احقر کے صرف مشفق باپ ہی نہیں بلکہ محسن ترین استاذ اور مربی بھی ہیں۔ جن کی مثالی تربیت اور کامل نگرانی اس ناکارہ کے لیے برابر راہ حق پر استقامت اور دینی

خدمات کی انجام دہی کے لیے ممد ومعاون بنتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آں موصوف کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائیں۔ آمین ثم آمین

☆ اپنی مخدومہ ومکرمہ والدہ معظّمہ نوراللہ مرقدھا کے نام جن کی مخلصانہ سحر گاہی دعائیں احقر کے لیے زندگی کا بڑا سرمایہ ہیں۔ رب رحمٰن ورحیم آں موصوفہ کی قبر کو جنت کے باغوں سے باغ بنا دے اور آپ رحمۃ اللہ علیہا کی دعاؤں کی بدولت اس نا کارہ کو ایسی دینی خدمات کی توفیق عطا فرمائے جو رضائے خداوندی کے ساتھ والدین مرحومین کی قبروں میں بے مثال ٹھنڈک کا ذریعہ بن جائیں۔ آمین

وما ذلك على الله بعزيز

احقر کفایت اللہ خان

مہتمم جامعہ مظاہر العلوم

خطیب مدینہ مسجد وحدت کالونی گوجرانوالہ

رابطہ نمبر: 0300-6422324

حروفِ چند

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رب مبلغ اوعی من سامع (رواہ البخاری)
المہمات چند عدیدہ خطبات کا مجموعہ ہے جن
کے پڑھنے والے لکھنے والے سے زیادہ باخبر
اور باذوق ہیں اس وجہ سے خطبات میں
اختصار کو پسند کیا گیا۔ امید ہے کہ قارئین خود
تفصیل فرمائیں گے۔

خویدم
حمید اللّٰہ
غفر اللہ لہ ولوالدیہ آمین

خطبہ مسنونہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ
وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ
شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ
اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ
وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ
وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهٗ
بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا م بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ
مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ
يَّعْصِهِمَا فَاِنَّهٗ لَا يَضُرُّ اِلَّا نَفْسَهٗ وَلَا يَضُرُّ
اللّٰهَ شَيْئًا اَمَّابَعْدُ

﴿اللہ تعالیٰ اور رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی باتوں پر یقین کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ "تو ایمان لاؤ اللہ اور رسول پر" (پ ۲۸ سورۃ التغابن آیت ۸)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ

"اے ایمان والو! ایمان رکھو اللہ پر اور رسول پر اور اس کتاب پر جو اپنے ان رسول پر اُتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اُتاری" (پ ۵ سورۃ النساء آیت ۱۳۶)

بعض باتیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ وہ آپ ہی اپنی دلیل ہوتی ہیں اور اپنے سے خارج دلیل کی محتاج نہیں ہوتیں۔ ایسی باتوں کی نسبت ضرب المثل بن گئی ہے کہ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ دیکھئے سورج اگر کسی دیکھنے والے سے کہے کہ دیکھو میں نکلا ہوں تو

دیکھنے والا اس کے اس دعوے کی کوئی دلیل طلب نہیں کرے گا۔ اسی طرح اگر ماں رات کو اندھیرے میں بچے کے قریب سوئی ہو اور بچہ رات میں بیدار ہو کر اندھیرے میں گھبرائے اور روئے تو ماں فوراً کہے گی کہ بیٹا گھبراؤ نہیں میں تمہارے پاس ہوں۔ بیٹا چوں کہ ماں کی آواز پہچانتا ہے تو وہ ماں سے دلیل طلب نہیں کرتا نہ ماں ہونے کی ...... نہ ماں کی آواز ہونے کی ...... بلکہ وہ سن کر مطمئن ہو جاتا ہے۔

ایک شخص عربی زبان میں دعویٰ کرتا ہے کہ میں عربی جانتا ہوں تو اس کے دعوے کی دلیل خود اس کے دعوے میں پنہاں ہے۔ ایک شخص نہایت خوشخط درخواست لکھ کر اس میں دعویٰ کرتا ہے کہ وہ کاتب ہے لہٰذا اسے کتابت کا کام دیا جائے تو اس کی یہ درخواست بیک وقت دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی۔ اس کی درخواست دیکھنے کے بعد کوئی شخص اس کے کاتب ہونے کی دلیل طلب نہیں کرے گا۔

پس خدارسیدہ لوگ اسی قسم کے ہوتے ہیں کہ جس طرح ماں کی آواز رات کے اندھیرے میں بچے کے لیے محتاج دلیل نہیں ہوتی اسی طرح جس شخص کے اندر ذوق صداقت ہو تو اس کی روح

کفر وفسق سے افسردہ نہیں ہوگی وہ نبی ﷺ سے معجزات کا طالب نہیں ہوگا۔ نبی ﷺ کا قول اور دیدار ہی طالبِ حق کے لیے معجزہ ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن السلام نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے ہی فرمایا تھا لیس ھذا الوجہ بوجہ کذاب (مشکوٰۃ) آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جو نبی ﷺ کا کوئی معجزہ دیکھ کر ایمان لایا ہو۔ معجزات برحق ہیں مگر کوئی حق کا طالب اس کا تقاضا نہیں کرتا ہے۔

پیش اور دعویٰ بود گفتار او
جهل باشد مایۂ انکار او

مردِ مومن کے لیے حق گمشدہ مال ہے۔ جہاں اس نے حق بات سنی وہیں اس کو اپنا لیا۔ پیاسے کو اگر کوئی کہے کہ اس گھڑے میں سے پانی پی لو تو تم نے کوئی ایسا منطقی پیاس سے بے تاب بھی دیکھا ہے جو کہے کہ پہلے اس کا ثبوت مہیا کرو کہ اس گھڑے میں پانی ہے؟ اسی طرح اگر ماں بچے کو دودھ پلانے کے لیے بلائے تو کیا بچہ ماں کے ماں ہونے کی یا دودھ کے دودھ ہونے کی کوئی دلیل طلب کرتا ہے؟ ایمان طلب انسانوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان کی روح حق کو پہچانتی ہے۔ جہاں صداقت نظر آئے وہ اس کی

طرف بیتابانہ لپکتی ہے۔ خدا ماں باپ سے کم شفیق نہیں۔ جس طرح بچے کے بلانے پر وہ نصف شب میں بول پڑتے ہیں تا کہ اس کو تسلی ہو جائے خدا بھی اسی طرح اپنی مخلوق کے قریب اور اس کا محافظ و محب ہے۔

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ط اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ''جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو ان کو بتا دو کہ ان کے قریب ہی ہوتا ہوں جب بھی وہ مجھے بلائیں میں ان کو جواب دیتا ہوں۔'' (پ۲، سورۃ البقرۃ، آیت ۱۸۶) ﴾

آج بھی یورپین پوچھتے ہیں کہ

...... نمازیں پانچ کیوں ہیں؟

...... ظہر میں چار، فجر میں دو رکعتیں کیوں ہیں؟

...... ظہر اور عصر سری جب کہ مغرب، عشاء اور فجر جہری کیوں ہیں؟

ان سے کوئی پوچھے کہ تمہارے کان دو کیوں ہیں چار کیوں نہیں...... اور دائیں بائیں کیوں ہیں آمنے سامنے کیوں نہیں ...... تمہاری آنکھیں سامنے کیوں لگی ہیں گردن کی طرف کیوں نہیں ...... ناک کے سوراخ منہ کی طرف ہونے کی بجائے آنکھوں کی

طرف کیوں نہیں ...... اگر وہ کہیں کہ یہ اللہ کے کام ہیں تو ہم کہیں گے کہ اسلام بھی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے ...... جیسے وہ قانون بنائے گا ہم بے چوں چراں اس کو مانیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿ معرفت الٰہی کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اما بعد! اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَتْ رُسُلُھُم اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ یَدْعُوْکُمْ لِیَغْفِرَلَکُمْ مِنْ ذُنُوْبِکُمْ وَیُؤَخِّرَکُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط "ان کے رسولوں نے کہا کیا اللہ میں شک ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین وہ تم کو بلاتا ہے تا کہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک جو ٹھہر چکا ہے۔ (پ ۱۳۔ سورہ ابراہیم)

ہم پھول کا نام سنتے ہیں تو اس کی خوبصورت شکل فوراً خیال میں آجاتی ہے اور جب سورج کو دیکھتے ہیں تو روشنی سمیت دیکھتے ہیں اور جب لیموں کو دیکھتے ہیں تو فوراً منہ میں پانی آجاتا ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ان چیزوں سے یہ اوصاف جدا نہیں ہو سکتے۔ مگر جب اللہ کا مبارک نام سنتے ہیں تو نہ تو اس کی صفت علیم کا خیال ہوتا ہے (ورنہ تنہائی میں گناہ نہ کرتے) ...... اور نہ اس کی صفت قدرت کا خیال کرتے ہیں۔ ورنہ خدا کا خوف محسوس کر کے گناہ چھوڑ

دیتے ...... اور نہ صفت رحمت کا خیال کرتے ہیں ورنہ امید کی بناء پر عبادت کرتے۔

آپ نے ایسا شخص نہ دیکھا ہوگا جو پھول کو جانتا ہو...... مگر اس کی خوبصورتی سے ناواقف ہو۔ سورج کو جانتا ہو...... مگر اس کی روشنی سے نا آشنا ہو۔ لیموں کو کٹتے دیکھے ...... مگر اس کے منہ میں پانی نہ آئے۔ تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اللہ کو تو مانیں ...... مگر اس کی صفات سے غافل رہیں۔ جس نے صفاتِ حق کو نہ پہچانا ...... اس نے ذاتِ حق کو نہ پہچانا۔ ذاتِ حق کی پہچان ہوتی ہے صفات سے ...... اور صفات کی پہچان ہوتی ہے افعال سے۔ مخلوقات کو پیدا کرنا خدائی افعال ہیں ان سے خدائی علم و قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ اور علم و قدرت کی صفات سے ذاتِ حق کی پہچان ہوتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے

اَلْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ
وَآثَارُ الْاَقْدَامِ عَلَى الْمَسِيْرِ
فَالسَّمٰوٰتُ الْعُلٰى وَالْاَرْضُ السَّبْعِ
كَيْفَ لَا تَدُلُّ عَلَى السَّمِيْعِ الْبَصِيْرِ

"اونٹ کی مینگنی اونٹ پر، اور پاؤں کے نشانات چلنے والے کے

موجود ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ تو کیسے یہ ساتوں زمین و آسمان سمیع وبصیر ذات کی وحدانیت کی دلیل نہیں ہوسکتے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب ذاتِ حق کو پہچانا تو دن کو روزہ سے ہوتے...... اور جہاد بھی کرتے ...... راتوں کو بھی جاگتے ......اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ "اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے" (پ۲۔البقرہ۔آیت ۲۳۸)﴾ کی تفسیر بنے کھڑے رہتے۔ فرمان ﴿ فُرْسَانٌ فِي النَّهَارِ وَرُهْبَانٌ فِي اللَّيْلِ "دن کو گھوڑوں پر سوار، اور رات کو عبادت کے شہسوار۔"﴾ مگر اس کے باوجود یہ کہتے ﴿ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِك "اے پروردگار! ہم تیری عبادت کا حق نہیں ادا کر سکے۔"﴾ یہ تو ان کی عبادات کا حال تھا اور تقویٰ اس درجہ کا تھا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو شاہِ روم نے قید کر دیا۔ پھر ان کے سامنے خنزیر کا گوشت ...... شراب ...... اور ناچنے گانے والی خوبصورت لڑکی بھیجی، مگر انہوں نے باوجود سخت بھوک پیاس کے کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ تین دن کے بعد اس لڑکی نے جو رپورٹ دی وہ یہ تھی کہ ﴿اِنَّكَ بَعَثْتَنِيْ اِلَى الْحَجَرِ لَا يَسْمَعُ وَلَا يَنْظُرَ "آپ نے مجھے ایک پتھر کی طرف بھیجا ہے جو نہ سنتا ہے اور نہ

دیکھتا ہے۔" ﴾ چشم فلک نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے انسان نہ دیکھے نہ دیکھے گی۔

خدا تعالیٰ اپنی ذات میں وحدہٗ لاشریک ہے اور صفات میں بھی۔ غیب دان ...... اور ہر جگہ حاضر و ناظر ...... صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اختیارات میں بھی وحدہٗ لاشریک ...... مخصوص ناموں میں بھی وحدہٗ لاشریک ہے۔ ﴿مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَاءُ لَمْ یَکُنْ "جو اللہ چاہتا ہے ہو جاتا ہے، اور جو وہ نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔" ﴾ تمام علوم کا مقصد بالواسطہ یا بلا واسطہ خدا تعالیٰ کی معرفت ہے اور جس نے خدا تعالیٰ کو صحیح معنوں میں پہچان لیا اس کی جان بخشی ہوگئی۔

عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایک رات گشت کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ چوروں کی ایک ٹولی کہیں بیٹھی ہے وہ بھی ان میں جا بیٹھا۔ چوروں نے پوچھا کہ حضرت آپ کون ہیں؟ سلطان نے کہا کہ میں بھی آپ ہی کا ہم پیشہ ہوں۔ ایک چور نے کہا کہ ہم اپنا اپنا ہنر بیان کرتے ہیں آپ بھی اپنا ہنر بیان کریں۔ اگر تمہیں بھی کسی فن میں کمال حاصل ہو تو

تم بھی ہمارے ساتھ شریک ہو سکتے ہو۔ ایک چور بولا کہ مجھ میں یہ ہنر ہے کہ کتے کی آواز سن کر بتا سکتا ہوں کہ کتا کیا کہہ رہا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ میں رات کو کسی اجنبی کو دیکھوں تو دن کو دیکھ کر فوراً پہچان لوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میرے ناک اتنی تیز ہے کہ میں زمین کو سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس کے نیچے سونا چاندی ہیں یا نہیں۔ چوتھے نے کہا کہ میرے بازو میں اتنی قوت ہے کہ میں مضبوط دیوار میں بھی نقب لگا سکتا ہوں۔ سب چور اپنے اپنے کمالات سنانے کے بعد سلطان کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے کہ اب آپ اپنا کمال بتایئے تو سلطان نے کہا کہ میری داڑھی میں یہ خاصیت ہے کہ مجرموں کو جلادوں کے حوالے کیا جا رہا ہو اور میں اپنے داڑھی کو ہلا کر رہائی کا اشارہ کر دوں تو فوراً رہا کر دیے جائیں۔

چوروں نے کہا کہ سب سے زیادہ کمال و ہنر والا تو یہی ہے۔

اس کے بعد پورے کا پورا طائفہ قصر شاہی کی طرف چلا۔ کتے کی آواز پہچاننے والے نے کہا کہ سلطان کا کتا یہ کہہ رہا ہے کہ سلطان تمہارے ہمراہ ہے مگر کسی نے یہ بات نہ سمجھی۔ پھر زمین

سونگھنے والے نے زمین کے ایک ٹیلے کو سونگھ کر بتایا کہ اس ٹیلے کے نیچے شاہی خزانہ ہے اس کے بعد نقب زن نے نقب لگائی تو خزانہ کو سیم وزر سے بھرپور پایا۔ جب سب کچھ لاد کر چلے تو سلطان بھی ان کے ہمراہ تھا تاکہ ان کا ٹھکانا دیکھ سکے۔ پھر سلطان چپکے سے غائب ہو گیا۔ صبح کو فوج بھیجی وہ سب کو گرفتار کر کے لائے۔ اندھیری رات میں دیکھے ہوئے اجنبی کو دن میں پہچاننے والے نے فوراً پہچان لیا کہ یہ تخت نشین تو وہی شخص ہے جو رات کو اپنی داڑھی کی خاصیت بتا رہا تھا۔ چناں چہ اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ہمارے تمام ہنر بیکار گئے اب آپ اپنے ہنر کا مظاہرہ فرمایئے تاکہ ہماری رہائی ہو جائے۔ اگر وہ بادشاہ کو نہ پہچانتا تو یقیناً سب کی گردن مار دی جاتی۔ لوٹا ہوا مال بھی جاتا اور جان بھی۔

اس واقعہ سے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ اگر خداشناسی حاصل ہو جائے تو تمام مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ معرفت نہ ہو تو باقی تمام علوم و ہنر ان چوروں کے کمالات کی طرح ہلاکت کا باعث بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا

فرمائیں کہ ہم حق تعالیٰ کو حقیقی صفات کے ساتھ پہچانیں۔ اور اُس کو بھی مانیں اور اُس کی بھی مانیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

وقت کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ ○ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○ ”تمہیں غافل رکھا مال کی زیادہ طلب نے یہاں تک کہ تم نے قبروں کا منہ دیکھا۔“ (پ۳۰،سورۃ التکاثر، آیت۱،۲)

فَقَد قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا اِنْتَبَھُوْا (الحدیث) ”لوگ نیند غفلت میں ہیں جب مریں گے جاگیں گے۔“

وقت بھی مال ہی کی طرح ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس لیے دونوں میں میانہ روی اور تدبیر کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ بلکہ مال سے زیادہ اہم وقت ہے کیوں کہ مال سے وقت نہیں بنایا جا سکتا اور وقت سے مال کو حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ کوئی بھی شخص تمام دینی اور دنیوی کمالات کے حصول میں وقت کا مرہونِ منت ہے یعنی ایک آدمی کے پاس وقت ہوگا تو تب ہی وہ تجارت، صنعت و ملازمت کر سکے گا۔ اسی طرح وقت ہوگا تب ہی وہ نیک اعمال کر

کے آخرت بنا سکے گا۔

ایک قریب المرگ کے پاس حسرت و یاس کے سوا ہے کیا؟ مال کو تو اپنے پاس جمع اور ذخیرہ کر سکتے ہیں ...... لیکن وقت اور زمانے کو روکنا یا ذخیرہ کرنا ممکن نہیں۔ پس وقت اور مال دونوں ہی اہم ہیں مگر ان میں وقت زیادہ اہم ہے۔ مگر دونوں کی قدر و قیمت کا مدار اس کا محل خرچ اور اچھے استعمال پر موقوف ہے۔

پس وہ بخیل جو اپنے مال کو قوت لا یموت سے زیادہ خرچ نہیں کرتا اصل فقیر ہے یا اُس جیسا ہے جس کی کل پونجی چند کھوٹے سکے ہوں۔ اس طرح جو شخص اپنے وقت کو اپنی اور اپنی جماعت کی سعادت و بہبود میں خرچ نہ کرے اس کی عمر بھی چند بے قیمت پھوٹی کوڑیوں کی مانند ہے۔ بلا شبہ ہم ایک محدود زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور لیل و نہار کا یہ چکر ایک خاص نظم سے جاری ہے۔ پھر زندگی بھی چند حصوں پر تقسیم ہے بچپن...... ، جوانی......، ادھیڑ عمر...... اور بڑھاپا۔ اور ہر حصۂ زندگی اپنا خاص عمل رکھتا ہے جو دوسرے حصہ میں غیر مناسب ہے جیسا کہ بے وقت زراعت نہیں ہوسکتی اور پھر چند روزہ زندگی کے بعد جب موت کا وقت آئے گا تو اس سے کسی ذی روح کو مفرّ کہاں؟ اور گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ بچپن گیا......

تو اب کہاں۔ جوانی ختم ہوگئی ...... تو یہ بہار گئی۔

بس جبکہ زمانہ بھی محدود ہے اور اس میں کمی و زیادتی ممکن نہیں اور اس کی قدر و قیمت حسن استعمال پر موقوف ہے تو از بس ضروری ہے کہ ہم اس کی پوری حفاظت کریں اور اس کو بہتر سے بہتر طریقہ پر استعمال کریں اور زندگی کی حفاظت اور اس سے نفع کی صورت ایک طریقہ کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں اور وہ یہ ہے کہ زندگی کا مقصد وحید صرف پسندیدہ اخلاق ہوں اور پھر اس کے لیے زندگی کے تمام وقت کو صرف کر دیا جائے۔ کیوں کہ انسان کے ضیاع وقت کے دو اسباب ہوتے ہیں ایک یہ کہ انسان کی کوئی غرض و غایت نہ ہو جس کے لیے وہ سعی کرے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے میں اس بات کو معیوب سمجھتا ہوں کہ تم میں سے کوئی لایعنی زندگی بسر کرے نہ دنیا کے لیے کوئی عمل کرے نہ آخرت کے لیے۔ لہٰذا اس پڑھنے والے کا وقت کس قدر ضائع ہے جو ہاتھ میں کتاب لیے ہوئے ہے مگر اس کے سامنے کوئی موضوع اور کسی خاص مسئلہ کی تحقیق مقصود مطلوب نہیں۔ اور اس آدمی کو کس قدر تکلیف ہوتی ہے جو چل رہا ہو اور نہیں جانتا کہ اس کے سفر کی غرض و غایت کیا ہے کبھی ایک سڑک سے

دوسری سڑک پر چل نکلا کبھی ایک دوکان سے دوسری دوکان کی طرف رخ کر دیا۔ اگر انسان کے سامنے غرض و غایت متعین ہوتی ہے تو تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کر لیتا ہے اور انسان سیدھی راہ پر لگا رہتا ہے۔ جو لوگ اپنی غرض کو متعین نہیں کرتے تو ان پر وقت اس طرح گزرتا ہے جس طرح اینٹ پتھر پر اور ایسے اشخاص سے کوئی بہتر کام یا عظیم الشان کارنامہ شاید ہی انجام پاتا ہو۔

بے مقصد انسان کی مثال اس کشتی کی سی ہے جو بغیر کسی ناخدا کے موجوں میں تھپیڑے کھاتی پھرتی ہے اور انسان کے ضیاع وقت کی دوسری شکل یہ ہے کہ اس کے سامنے غرض و غایت تو معلوم ہے لیکن وہ اس مقصد کے حق میں مخلص نہیں۔ اس لیے نہ اس تک پہنچنے کے لیے ٹھیک جدوجہد کرتا ہے نہ ایسے کام کو سرانجام دیتا ہے جو اس کے مقصد کے مطابق ہو۔ پس غرض کا متعین نہ ہونا......، مقصد کے حق میں مخلص نہ ہونا......، یہی وہ دو چور ہیں جو وقت کو چوری کر لیتے ہیں اور اس کے فوائد کو برباد کرتے ہیں۔ اور وقت کی حفاظت کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ انسان مسلسل کام ہی میں مصروف رہے اور کسی وقت آرام نہ کرے بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ راحت و فراغت کے

وقت کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ عملی جدوجہد کے لیے زیادہ قوی اور تروتازہ بنا دے۔

وقت کی قیمت کا دار ومدار مقصد کے قیمتی ہونے پر ہے اگر مقصد کم قیمت ہے تو وقت بھی کم قیمت ہوگا اور اگر مقصد بیش قیمت ہے تو وقت بھی بیش قیمت ہوگا۔ایک انسان دنیا کو اپنا مقصد بناتا ہے تو جتنی قیمت دنیا کی ہے اتنی ہی قیمت اس کے وقت کی ہوگی۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلے میں اتنی بھی نہیں جتنا سوئی سے لگا پانی سمندر کے مقابلے میں۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر دنیا کی قیمت خدا کے یہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ پلاتا ﴿لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا عِنْدَ اللّٰهِ تعدل جناح بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى مِنْهَا كَافِرًا شربة (الحديث)﴾ اس کے برعکس ایک انسان دین کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے تو اس کا وقت اتنا ہی بیش قیمت بنے گا جتنا کہ دین بیش قیمت ہے۔ ﴿ لَغُدْوَةٌ اَوْ رَوْحَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا "اللہ کے راستے میں صبح وشام ایک ساعت دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔" ﴾

الغرض وقت ایک خام جنس ہے جیسا کہ بڑھئی کے ہاتھ میں

خام لکڑی یا لوہار کے ہاتھ میں خام لوہا ان میں سے ہر ایک کاریگر مختار ہے کہ ان کو چھوڑ کر برباد کر دے یا پھر ان سے عمدہ اشیاء تیار کرے۔ پھر اگر ان سے سائیکل بنا دے تو اس کی قیمت کم ہوگی اور اگر موٹر سائیکل بنا دے تو اس کی قیمت اور بڑھ جائے گی اور اگر ہوائی جہاز بنا دیا تو قیمت اور بھی زیادہ ہوگی۔ اسی طرح اگر مقصد کم قیمت والی دنیا کو بنا لیا گیا تو وقت بھی کم قیمت ہوگا اور اگر مقصد دین اور خدا کی عبادت سمجھی گئی تو جتنا قیمتی دین ہے اتنا قیمتی وقت ہوگا بلکہ ہر وہ کام اور چیز جو دین کے بغیر ہو وہ بے قیمت ہے۔

اسی لیے صوفیائے کرام رحمہم اللہ لکھتے ہیں دس چیزیں بے کار اور ضائع ہیں

اول وہ علم جس پر عمل نہ ہو......

دوم وہ عمل جس میں اخلاص نہ ہو......

تیسرا وہ مال جس میں اللہ تعالیٰ کے نام پر خرچ نہ ہو......

چوتھا وہ دل جس میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہ ہو......

پانچواں وہ بدن جو طاعت اللہ تعالیٰ میں استعمال نہ ہو......

چھٹی چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا وہ دعویٰ جس سے اطاعت میں دلچسپی نہ ہو......

ساتواں وہ خوف اور امید جو مخلوق سے ہو حالاں کہ مخلوق کی پیشانی خالق کے قبضہ میں ہے......

آٹھواں وہ فکر جس میں خواہشات گھومیں......

نواں وہ خدمت جو تجھے خدا کے قریب نہ کرے......

دسواں وہ وقت جس میں آخرت کے لیے تیاری نہ ہو۔

(الفوائد: لابن القیم جوزیؒ۔ص ۱۲۶)

پھر ان سب میں زیادہ نقصان ''تضیع قلب'' اور'' تضیع وقت'' کے اندر ہے۔ پھر قلب کی تضیع کا سبب یہ ہے...... کہ انسان دنیا کو آخرت پر ترجیح دے اور تضیع وقت کا سبب یہ ہے...... کہ انسان لمبی امیدیں رکھے۔ پس فساد کی جڑ اتباع ہَوا اور طول امل ہے اور اصلاح ساری کی ساری اتباع ہدایت اور استعداد للموت میں ہے۔

سال ایک درخت ہے...... اور مہینے اس کی شاخیں ہیں...... اور دن اس کی ٹہنیاں ہیں...... اور گھڑیاں اس کے پتے ہیں...... اور سانسیں اس کا پھل ہیں۔ پس جس کی سانسیں اطاعت و تقویٰ میں گزرتی ہوں تو اس کا درخت طیب ہے...... شاخیں مضبوط ہیں ...... ٹہنیاں خوبصورت ہیں...... پتے ہرے بھرے ہیں...... اور پھل میٹھا ہے۔

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ (پ۱۳۔ ابراہیم۔ آیت ۲۴)

''جیسے ایک درخت ستھرا اُس کی جڑ مضبوط ہے اور ٹہنے آسمان میں لاتا ہے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے۔''

اور جس کی سانسیں گناہ میں گزرتی ہوں تو اس کا درخت اول تا آخر خبیث ہے۔

كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (پ۱۳۔ ابراہیم۔ آیت ۲۶) ''جیسے درخت گندا اُکھاڑ لیا اُس زمین کے اوپر سے کچھ نہیں اُس کو ٹھہراؤ۔''

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿اتباع حق کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

قَالَ النَّبِيُّ ﷺ سَدِّدُوْ اَوْ قَارِبُوْا "درست رہواور میانہ روی اختیار کرو۔" (الحدیث)

اگر آپ پاکستان میں ہیں اور سعودی عرب جانا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو پاکستان چھوڑنا پڑے گا پھر آپ سعودی عرب میں موجود ہو سکتے ہیں۔ جو آدمی حق کا طالب ہو وہ بھی گویا ایک قسم کا مسافر ہے اگر وہ اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے تو اس کی ایک ہی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ اپنی سابقہ جگہ کو چھوڑنے پر راضی ہو جائے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنی مطلوب منزل پر پہنچنے کی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کچھ لینے کے لیے کچھ دینا پڑتا ہے۔ یہاں کھونے میں پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔ اگر آپ نفع بخش تجارت کے مالک بننا چاہتے ہیں......تو پہلے اپنے اثاثہ اس میں کھپانا پڑے گا۔ اگر آپ اپنے کھیت میں ہری بھری فصل

دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنا چاہتے ہیں ...... تو پہلے اپنے بیج کے ذخیرے کو مٹی میں ملانا ہوگا۔ اگر آپ دولت مند بننا چاہتے ہیں ...... تو اپنے خودی جذبات کو کچل دینے پر اپنے آپ کو راضی کرنا پڑے گا۔ جو ذرہ نہ پھٹے ...... وہ ایٹمی طاقت نہیں بنتا۔ جو دانہ اپنے آپ کو فنا نہ کرے ...... وہ درخت کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ یہی معاملہ حق کا بھی ہے کوئی شخص حق والا اس وقت بنتا ہے جب وہ حق کی خاطر اپنے آپ کو فنا کر دے۔ جو شخص اپنے وجود کو فنا کرنے کے لیے تیار نہ ہو ...... وہ کبھی حق والا نہیں بن سکتا۔ حق کو پانے کے لیے اپنے آپ کو کھونا پڑتا ہے۔

حق پرست وہ شخص کہلائے گا جو حق ظاہر ہونے کے بعد حق پرستی کو اتنا ضروری سمجھے جتنا بھوکا پیاسا شخص دانہ پانی ملنے کے بعد کھانے پینے کو ضروری سمجھتا ہے۔ اور حق پر چلنے میں لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرے۔ جیسے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سخت ترین احتجاج کے باوجود وہی کیا جسے آپ نے حق سمجھا۔ جب تک قرآن نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین نہ کہا تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دل برداشتہ ہی رہے مگر آپ ﷺ نے ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (پ۴۔ سورۃ ال عمران۔ آیت ۱۵۹) ''جب پھر قصد کر چکا

تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر۔﴾ ہی پر عمل کیا۔ اسی طرح......آپ ﷺ نے جب حق تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا کہ ﴿ لَا تَقُمْ فِيهِ اَبَدًا (پ ۱۱ سورۃ توبہ آیت ۱۰۸) ''تو نہ کھڑا ہو اس میں ہمیشہ۔'' ﴾ تو مسجد ضرار کو آگ لگا دی اور لوگوں کے بگڑنے کی ذرا پرواہ نہ کی۔

اسی طرح......فتنہ ارتداد میں جب اہل یمن بگڑ گئے اور زکوٰۃ کا انکار کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی نرم سلوک کی رائے دے رہے تھے لیکن خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کسی کی نہ مانی اور مرتدین کے خلاف تنہا تلوار لے کر کھڑے ہو گئے۔ اسی طرح......حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیعتِ رضوان کے درخت کو باوجود لوگوں کی رغبت کے اکھڑوا دیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کو چھوٹی سی بات پر سپہ سالاری سے موقوف کر دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو معمولی خلاف ورزی پر پگڑی گلے میں ڈال کر دربارِ خلافت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

اسی طرح......لوگوں کی اصطلاح کے خلاف حجر اسود کو مخاطب کر کے فرمایا ﴿ وَاللّٰهِ اِنَّكَ لَحَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ لَوْ لَا اِنِّيْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يصبلك ما قبلتك ''اللہ کی قسم! بیشک تو ایک پتھر ہے اور تو نفع اور نقصان نہیں دے سکتا۔ اگر میں رسول اللہ ﷺ کو تیرا بوسہ لیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں تیرا کبھی بوسہ نہ لیتا۔'' ﴾ اسی طرح ...... حضرت

طارق رضی اللہ عنہ بن زیاد مجاہدین اسلام کا ایک جم غفیر لے کر ہسپانیہ فتح کرنے کی غرض سے سمندر پار کر گئے۔ جبل الطارق کے سامنے اس مقتدر اسلامی جرنیل کے دماغ میں آئی کہ ہسپانیہ کو فتح کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا فوراً تمام کشتیوں کو جلا دینے کا حکم دیا۔ سپاہی حیران تھے کہ یہ کیسا حکم ہے۔ صدائے احتجاج بلند کرنے اور اپنے زعم میں مشورے دینے لگے۔ طارق رضی اللہ عنہ نے ایک نہ سنی اور سب جہازوں کو خاکستر کر دیا۔

طارق چو بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا است
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم
ترک سبب زروئے شریعت کجا روا ست
خندید و دست خویش شمشیر بردو گفت
ہر ملك ملك ما ست كہ ملك خدائے ماست

اسی طرح محمود غزنویؒ نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ اس کی فوج کئی دفعہ بددل ہوئی مگر محمود نے کسی کی نہ سنی اور حملوں پر حملے کرتا گیا۔ حق پرستی اس کا نام ہے اللہ تعالیٰ حق پرستوں کے ساتھ مرنا جینا نصیب فرماویں۔

......☆......☆......☆......☆......

غلطی دُور کرنے کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

وَقَالَ اللّٰہ تَعَالٰی وَمَا قَدَرُوا اللّٰہ حَقَّ قَدْرِہٖ ''اور نہیں قدر کی لوگوں نے اللہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق تھا۔''

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا ''ہم راضی ہیں اللہ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد کے نبی ہونے پر۔''

انسان نے ہمیشہ خدا کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے اور اپنے آپ کو سمجھنے میں بھی۔ ایک غلطی یہ ہے کہ اس نے خدا کو اپنے جیسا سمجھ لیا اور دوسری غلطی یہ کہ اس نے اپنے آپ کو خدا جیسا سمجھ لیا۔ یہی ہر دور میں انسان کی غلطی رہی ہے۔ خدا کو اپنے جیسا سمجھنا یہ ہے کہ خدا کو انسانی سطح پر اتار لایا جائے۔ الحاد اور شرک کی تمام قسمیں اسی غلطی کی پیداوار ہیں۔ انسان جب کوئی کام سرانجام دیتا

ہے تو بہت سے لوگوں کی مدد سے انجام دیتا ہے۔ اسی بنا پر اس نے خدا کے بھی شریک اور مددگار فرض کر لیے۔ انسان کے یہاں بڑے لوگوں کی سفارشیں چلتی ہیں چناں چہ مان لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ مخصوص اور قریبی لوگ ہیں جو خدا کے دربار میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور خدا ان کی سفارش قبول کرتا ہے۔

اپنے آپ کو خدا جیسا سمجھنا یہ ہے کہ آدمی یہ گمان کرے کہ وہ اپنی تقدیر کا آپ مالک ہے۔ انسان کے اوقات گزارنے میں...... جسمانی قوت صرف کرنے میں ...... مال کے خرچ کرنے میں ...... اور اولاد کی تربیت میں...... اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے۔ اس قسم کی ہر کوشش گویا اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھانا ہے۔ مگر ایسا ہر گمان اس کائنات میں باطل اور سراسر باطل ہے کیوں کہ انسان صرف ایک عاجز مخلوق ہے اور یہ کسی بھی اعتبار سے خالق کا درجہ اختیار نہیں کر سکتا۔

انسان کا فرض یہ ہے کہ اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے تب خدائی عنایات کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ اپنی عنایات کی بارش برساتا ہے۔ دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ

کی خاطر باپ کو چھوڑا...... اللہ تعالیٰ نے ان کو پوری ملتِ اسلامیہ کا باپ بنا دیا۔ ﴿مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ (پ۱۷سورۃ الحج آیت ۷۸) ''دین تمہارے باپ ابراہیم کا۔'' ﴾ پھر اللہ تعالیٰ کی خاطر قوم کو چھوڑا...... اللہ نے ان کو انبیاء علیہم السلام کا باپ بنا دیا۔ پھر اللہ کے حکم پر مکہ کی زمین کو چھوڑا...... تو اللہ نے قیامت تک کے لیے مکہ کو ان کی یادگار بنا دیا۔ ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (پ۱سورۃ البقرہ آیت ۱۲۵) ''اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ نماز کی جگہ۔'' ﴾ پھر انہوں نے اپنے اہل خانہ کو نماز کے لیے وقف کر دیا ﴿رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ (پ۱۳سورۃ ابراہیم آیت ۳۷) ''اے رب ہمارے تاکہ قائم رکھیں نمازوں کو۔'' ﴾ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے نمازیوں کے ساتھ ثواب میں آپ کو شریک فرمایا۔ ﴿كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيمَ ''جس طرح تو نے رحمت بھیجی ابراہیم پر۔'' ﴾ پھر بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کر دیا...... تو اللہ تعالیٰ نے ذبح عظیم کے خطاب سے نوازا۔

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور انسان عاجز مطلق۔ اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان جو تقسیم ہے وہ زیادہ اختیار اور کم اختیار کی نہیں بلکہ اختیار اور بے اختیاری کی ہے۔ یہاں سارا اختیار اللہ

تعالیٰ کے پاس ہے اور ساری بے اختیاری انسان کے حصہ میں آتی ہے۔ انسان حقیقی طور پر خدا سے مانگنے والا بن جائے تو خدا تعالیٰ یقیناً اس کی حاجت روائی فرمائے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے:
''مانگو تو تم کو دیا جائے گا...... ڈھنڈو گے تو پاؤ گے...... دروازہ کھٹکھٹاؤ گے تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔''

تم میں سے کون ایسا آدمی ہے کہ اگر اس سے اس کا بیٹا روٹی مانگے......تو وہ اسے پتھر دے دے یا اگر مچھلی مانگے......تو وہ اسے سانپ دے دے۔ پس جب تم کمزور ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا چاہتے ہو تو تمہارا اللہ جو کہ طاقت ور ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ابتداء وہاں سے ہوتی ہے جہاں سے انسانی طاقت کی انتہا ہوتی ہے۔ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے جب ان کو کنویں میں پھینک دیا تو ان کی قدرت کا خاتمہ ہوا ...... خدائی قدرت نے ان کی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اور جب تاجروں نے غلام ظاہر کر کے اپنی قدرت کا خاتمہ کیا......تو خدائی قدرت نے عزیز

مصر کے گھر پہنچا دیا۔ اور جب عزیز مصر کے گھر والوں نے جیل بھیج دیا......تو خدائی قدرت نے مصر کا بادشاہ بنا دیا۔

﴿رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا

''ہم راضی ہیں اللہ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر۔''﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿حکمت الٰہیہ کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

وقال الله تعالٰى وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

خدا کی دنیا میں انسان بظاہر ایک متضاد شخصیت کا حامل ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سورج ہر روز ٹھیک اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے وہاں انسان کا حال یہ ہے کہ آج ایک بات کہتا ہے..... کل اس سے پھر جاتا ہے۔ سورج روز مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوجاتا ہے..... مگر انسان کا حال یہ ہے کہ روز اپنا مشرق و مغرب بدل لیتا ہے۔ صبح مومن شام کو کافر، ..... پارٹیاں بدل لیتا ہے، ...... پالیسیاں بدل لیتا ہے۔ آج کا انسان ہوائی کوا ہے، جدھر ہوا کا رخ ہوا..... اُدھر کو چل پڑا۔ اس دنیا میں سخت پتھروں سے بھی پانی نکل پڑتا ہے..... مگر انسان کا حال یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ بد ترین بے دردی اور سفاکیت کا سلوک کرتا ہے۔ اس دنیا میں چاند

تمام مخلوق کے اوپر بلا امتیاز چمکتا ہے..... مگر انسان باپ کے ساتھ سلوک کچھ کرتا ہے اور دوستوں کے ساتھ کچھ۔

اس دنیا میں ہر چیز کا ضمیر اپنے آپ کو پھولوں کی لطافت کی صورت میں ظاہر کرتا ہے..... مگر انسان کانٹوں سے بھی زیادہ برے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس دنیا میں ہواؤں کے جھونکے ہر طرف بے غرض خادموں کی طرح پھر رہے ہیں..... مگر انسان اس طرح رہتا ہے جیسے ذاتی غرض پوری کرنے کے سوا کوئی اور مقصد ہی نہیں۔ اس دنیا میں ایک درخت دوسرے درخت کو دکھ نہیں دیتا...... مگر انسان دوسرے انسان کو ستاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے..... مگر خدا یہاں مداخلت نہیں کرتا اور اس تضاد کو ختم نہیں کرتا۔ خدا انسانوں کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھتا ہے..... مگر اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس سے لوگ یہ غلط گمان کرتے ہیں کہ خدا پتھر کی مورتی ہے (العیاذ باللہ)..... مگر یہ گمان اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ مخلوقات کے بارے ہم خالق کی حکمت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔

خالق کی نظر میں دنیا دارالامتحان ہے ...... مگر ہم اس کو دارالجزاء کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ کل پیش آنے والا ہے ...... ہم چاہتے ہیں کہ آج ہی کے دن ہماری آنکھوں کے

سامنے آجائے۔ جس طرح روز رات کے اندھیرے کے بعد سورج کی روشنی پھیلتی ہے...... اور خزاں کے بعد بہار کا آنا لازمی ہے ......اسی طرح لازماً یہ بھی ہونے والا ہے کہ زندگی کا اندھیرا ختم ہو...... ظالم اور مظلوم ایک دوسرے سے الگ کیے جائیں ...... اور مظلوم کو بدلا دلوایا جائے...... سرکش انسانوں کی گردنیں توڑی جائیں ...... اور سچے انسانوں کو ان کی سچائی کا انعام دیا جائے۔ یہ سب کچھ اپنی کامل ترین صورت میں ہوگا...... مگر...... وہ موت کے بعد ہوگا نہ کہ موت سے پہلے۔

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ (پ۲۔ سورہ بقرہ۔ آیت ۲۱۴)

"کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تم کو پہلے لوگوں سی مشکلیں تو پیش آئی ہی نہیں۔ ان کو سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ صعوبتوں میں ہلا ہلا دیئے گیے یہاں تک کہ پیغمبر اور مومن لوگ جو انکے ساتھ تھے سب پکار اٹھے کہ کب خدا کی مدد آئے گی۔ دیکھو خدا کی مدد قریب ہے۔"﴾

ان کے چمڑے اتارے گئے...... آریوں سے چیر دیے گئے...... مگر نہ ان کے قدم ڈگمگائے ......اور نہ ان کے حوصلے پست ہوئے...... بالآخر کامیابی نے انہی کے جوتے سیدھے کیے، جنہوں نے حق کی خاطر قربانیاں دی تھیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ایمان اور اعمال صالحہ کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

وقال اللہ تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (پ۱۶۔سورہ مریم۔آیت۹۶)

"بیشک جولوگ ایمان لائے ہیں اور کی ہیں اُنہوں نے نیکیاں اُن کو دیگا رحمٰن محبت"

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ایک بڑی نعمت کا ذکر کیا ہے اور وہ نعمت ہے حق تعالیٰ کا محبوب ہونا۔ اور دوسرا اس نعمت کو حاصل کرنے کا راستہ بتایا ہے اور وہ ہے ایمان اور اعمال صالحہ۔ یعنی مقصود محبت ہے جو سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا میں ذکر ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ اس نعمت کا حاصل کرنے کا راستہ ہیں جو اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰت میں ذکر ہے۔ طریقہ اختیار کرنا ہمارا کام ہے...... اور نعمت کا عطا کرنا حق تعالیٰ شانہ کا کام ہے۔ جو کام ہمارے کرنے کے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک ظاہری اور

دوسرا باطنی۔ ایمان عمل باطن ہے اور اعمالِ صالحہ ظاہری اور یہ طریقہ اور اس کا مقصود لازم وملزوم ہیں۔ ہم ایمان اور اعمال صالحہ اختیار کریں گے تو اللہ جل شانہ ہم سے محبت کرے گا۔ اور اگر اللہ نے محبوب بنالیا......تو ہم ضرور اعمال صالحہ کریں گے۔ پہلی صورت کا نام سلوک ہے اور دوسری صورت کا نام جذب ہے۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بخت اگر مدد کن دامنش آورم بکف

گر بکشد زہے طرف و ربکشم زہے شرف

((تقدیر اگر ساتھ دے تو اس کا دامن ہاتھ سے پکڑوں گا۔ اگر اس نے کھینچا تب بھی خوشی۔ اگر میں نے کھینچا تو بھی عزت ہے))

یعنی مقصود رضائے حق ہے چاہے محبت پہلے اور اعمالِ صالحہ بعد میں ہوں یا اعمالِ صالحہ پہلے اور محبت ثانیاً ہو۔

اب سمجھیں کہ محبت کیا چیز ہے اور اعمالِ صالحہ کیا چیز ہیں۔

ایمان تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کو اس کی تمام صفات اور اختیارات مع اس کے جمیع اخبارت کے ایک زندہ اور حقیقی عقیدہ کے ماتحت مانیں۔ ﴿اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ (الحدیث) "یہ کہ آپ ایمان لائیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں

پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔'' ﴾

خدا پر عقیدہ کی بھی دو صورتیں ہیں ایک یہ ہے کہ خدا پر تقلیدی عقیدہ اور دوسرا ہے زندہ اور تحقیقی عقیدہ۔ خدا پر تقلیدی عقیدہ ایک بے جان عقیدہ ہے۔ ایسا عقیدہ جو آدمی کی روح کو نہیں تڑپاتا، اس کی رگوں میں بجلی بن کر نہیں دوڑتا۔ وہ آدمی کے اندر کوئی ہلچل پیدا نہیں کرتا۔ اس تقلیدی عقیدہ میں خدا کو ماننا ہوتا ہے مگر خدا سے ڈر نہیں ہوتا۔ جیسے عجائب گھر میں شیر وغیرہ کی کھال میں بھس بھر کر اس کو کھڑا کر دیا جائے بظاہر وہ شیر کی مانند ہوتا ہے مگر وہ صرف شیر کی صورت ہوتی ہے نہ کہ فی الواقع شیر۔ ایسے شیر کو لوگ صرف تفریح کی طور پر دیکھتے ہیں۔ کوئی شخص اس سے ڈرنے یا بھاگنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مگر خدا پر زندہ عقیدہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا پر زندہ عقیدہ خدا کو اس کی اتھاہ قوتوں کے ساتھ دیکھ لینے کا نام ہے۔ جو شخص اس طرح خدا کو پالے وہ پانے کے بعد ویسا نہیں رہ سکتا جیسا کہ وہ پانے سے پہلے تھا۔ خدا کو پانے کے بعد اس کے سارے وجود کے اندر بھونچال آ جاتا ہے خوف کی شدت سے اس کی روح سہم اٹھتی ہے۔ اس کے ذہن سے تمام مسائل حذف ہو جاتے ہیں۔ خدا کا زندہ عقیدہ اور خدا کا خوف

دونوں ناقابل تقسیم ہیں۔ جیسے جنگل کا شیر ایک زندہ شیر ہے وہ جب چلتا ہے تو سارا جنگل سہم اٹھتا ہے۔ اور جب وہ دھاڑتا ہے تو جانور دہشت زدہ ہو کر گر پڑتے ہیں۔ جب کوئی شخص زندہ شیر کو دیکھتا ہے تو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے تمام ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں۔ وہ ویسا نہیں رہتا جیسا اس کو دیکھنے سے پہلے تھا۔

اعمال صالحہ کے لیے تین شرطیں ہیں۔

۱۔ ﴿ اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ اَدْوَمُهَا (الحدیث)
''اللہ تعالیٰ کا محبوب عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے۔'' ﴾

۲۔ سنت کے موافق ہونا ﴿ خَيْرَ هَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ (الحدیث) ''رسول اکرم ﷺ کی سیرت بہترین سیرت ہے۔'' ﴾

۳۔ صحیح نیت اور جذبہ

اگر نیت نہ ہو...... یا صحیح نہ ہو...... تو عمل صالح صالح نہیں رہے گا۔ فرض کرو ایک روبوٹ انسانی شکل میں بنا ہوا ہو اور انسانی کام بھی کرتا ہو اور آپ اس سے کہیں کہ پانی لاؤ وہ پانی کا گلاس لے آئے تو روبوٹ کو اس کے عمل کی جزاء نہیں ملے گی۔ دوسری طرف ایک انسان ہے اس نے دیکھا کہ ایک شخص پیاس سے بے تاب ہے وہ روانہ ہوتا ہے اور اس پیاسے کو پانی پلاتا ہے۔ اس

وقت اس کے دل میں ایک طوفان برپا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایسے آدمی کو اللہ اجر دے اور اس کے بدلے اس کو ایسے دن پانی پلائے جس دن خدا کے سوا کسی کے پاس پانی نہ ہوگا۔ روبوٹ اور انسان میں یہ فرق کیوں ہے؟ جو کام انسان نے کیا وہی روبوٹ نے بھی کیا..... مگر انسان کو ایک گلاس پانی کے بدلے جنت دے دی گئی جبکہ روبوٹ کو اسی قسم کے ایک گلاس پانی پر کوئی انعام نہیں ملا۔ اس کی وجہ نیت اور جذبے کا فرق ہے۔ روبوٹ کا عمل بے شعوری کی سطح پر تھا اور انسان کا عمل شعور کی سطح پر۔

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ان کے لیے جلد ہی حق تعالیٰ صورت پیدا کرے گا یعنی ایمان اور اعمالِ صالحہ کے بدلے یہ سودا نقدا نقدی ملے گا ادھار نہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ محبت کی چار قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ..... حق تعالیٰ محبّ ہوں اور بندہ محبوب ہو۔

دوسرا یہ کہ..... حق تعالیٰ محبوب ہوں اور بندہ محبّ ہو۔

تیسرے یہ کہ..... مخلوق کو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔

چوتھے یہ کہ..... خلق سے اس کو خدا کے لیے محبت ہو جاتی ہے۔

آخری تین قسموں کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے اور دنیا ہے نقد۔

اس لیے سَيَجْعَلُ میں لفظ س لایا گیا جو نقد سودے کی نشانی ہے۔
اور پہلی قسم کے اعتبار سے وُد کے تین معنیٰ ہیں۔

اول یہ کہ...... اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مزید اعمال کی توفیق عطا فرماتا ہے اور اس کا ظہور بھی دنیا میں ہوتا ہے اور دنیا اور ما فیھا نقد ہے۔

دوم یہ ہے کہ...... اللہ تعالیٰ اہل ایمان و عملِ صالحہ کو مرنے کے فوراً بعد مطلع کرتا ہے کہ ﴿هٰذَا مَقْعَدَكَ مِنَ الْجَنَّة ''تیرا ٹھکانہ اس جنت میں ہے۔''﴾ اور موت کا امکان ہر وقت ہے لہٰذا یہ بھی نقد و نقدی ہے۔

سوم یہ کہ...... اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ثمرہ آخرت میں جنت کی شکل میں دے گا اور آخرت بھی نقد ہے گو ہم اس کو دُور سمجھتے ہیں۔ ﴿ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَنَرَاهُ قَرِيْبًا (پ۲۹۔سورۃ المعراج۔آیت ۶-۷) وہ دیکھتے ہیں اس کو دُور اور ہم دیکھتے ہیں اس کو نزدیک۔''﴾

ہمارا آخرت کو دُور سمجھنا ایسا ہے جیسا کہ چیونٹی اپنے سوراخ سے پانی کے گھڑے کو دُور سمجھتی ہے مگر ہم اس کو قریب سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو سمجھ عطا فرمائے۔

......☆......☆......☆......☆......

﴿مکافات عمل کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

وقال الله تبارك وتعالىٰ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (پ۳۔سورۃ البقرۃ۔آیت) ”اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا۔“

ہر شخص کے اعمال کا فائدہ اس کو پہنچے گا اور اس کا برا نتیجہ بھی اسی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ انسان کے اکثر اعمال کے نتائج ابتداء میں نمودار نہیں ہوتے اور انسان دھوکے میں رہتا ہے۔ اس کے اعمال کا خراب اثر اس کے باطن پر نہیں پڑا۔ ایک شخص کسی کو ظلم سے قتل کر دیتا ہے...... یا کسی مظلوم کا مال چھین لیتا ہے اور اگر وقتی طور پر وہ خدائی قانون کی گرفت میں نہیں آتا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرا کچھ نہیں بگڑا مگر یہ نفس کا دھوکہ ہے۔ یہ جہان جزا و سزا کے معاملے میں ایک پہاڑ کی طرح ہے۔ یہاں ہر نداء کی صدائے بازگشت ہے۔ ہر آواز کی ایک گونج ہے۔ بظاہر کان اسے سنے یا نہ سنے وہ صدا اس

کے باطن سے ضرور ٹکراتی ہے۔ یا اعمال کی مثال دیوار کی طرح ہے اور سزا اس کا سایہ کہ طلوع آفتاب کے وقت سایہ دور دور پڑتا ہے جیسے سورج نصف النہار کے قریب ہوتا جاتا ہے سایہ دیوار سے چمٹتا جاتا ہے۔ اسی طرح اعمال ہر چند کہ متعدی بغیر ہوتے ہیں۔ مگر آخر کار ان کی سزا صاحب عمل کو مل کر رہتی ہے۔

گرچہ دیوار افگند سایہ دراز
بازگرد دوائے او آن سایہ باز
این جہان گو است و فعل ماندا
سوئے ما آید ندا ھارا صدا
از مکافات عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جوز جو

جس طرح ریشم کا کیڑا اپنے ہی منہ سے نکلے ہوئے دھاگے کی لپیٹ میں آکر دم توڑ دیتا ہے اسی طرح گنہگار شخص اپنے ہی جرائم کی پاداش میں عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ ﴿ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (پ۲۵۔سورۃ الشوریٰ۔آیت ۳۰) "اور جو پڑے تم پر کوئی سختی سو وہ بدلہ ہے اس کا جو کمایا تمہارے ہاتھوں نے۔" ﴾ یہاں تک کہ حرام غذا کا اثر انسان کی روح پر بھی پڑتا ہے۔ روزی

ایک تخم اور خیالات اس کا ثمر ہیں۔ حرام روزی سے ہی خراب خیالات پیدا ہوتے ہیں۔

روح کی مثال ایک چراغ جیسی ہے۔ حلال کی روزی اس میں روغن کا کام دیتی ہے۔ حرام روزی سے اس چراغ میں پانی پڑ جاتا ہے اور چراغ بجھ جاتا ہے۔ ہاں خدا کی فطرت میں ہر قسم کے نتیجے کے لیے ایک معیاد معین ہے۔ ناممکن ہے کہ اس میعاد کے پورا ہونے کے بعد اس کا نتیجہ برآمد نہ ہو۔ لیکن انسان فطرتاً جلد باز ہے۔ خلق الانسان عجولا ۔ پہاڑ کے اندر پتھر کو لعل بننے کے لیے ایک عرصہ دراز چاہیے۔ میوہ دار درخت پانچ سال سے پہلے پھل نہیں دیتے۔ گل سرخ کا پودا ایک سال میں پھول دیتا ہے۔ اسی قانون کو اللہ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ (پ ۷۔ سورۃ انعام۔ آیت ۲) ''خدا وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر تمہارے ارتقاء کے لیے ایک مدت معین کر دی اپنے علم میں پھر تم لوگ شک میں مبتلا رہتے ہو۔''﴾

پانی میں بھی جوش آگ پر رکھنے کے فوراً بعد نہیں آتا بلکہ کچھ دیر بعد جوش آتا ہے یہی حال گناہوں کا ہے۔ ان سے بھی غضب

خداوندی بتدریج اپنی انتہا پر پہنچتا ہے۔ اللہ پاک اچھے اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿عملی زندگی کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

وقال اللہ تعالیٰ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (پ۴۔ال عمرآن۔آیت۲۰۰) ”اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔“

اس آیت کریمہ میں عملی زندگی کا بیان ہے۔ اسلام میں آنے کے بعد عمل کا پہلا درجہ ہے...... اور تقریر کا دوسرا درجہ ہے۔ چراغ عملاً روشن ہوتا ہے...... تب مکان کو روشن کرتا ہے۔ پھول میں عملاً خوشبو ہوگی...... تب کسی کا دماغ معطر کرے گا۔ گھڑے میں عملاً پانی ہوگا...... تب دوسروں کو سیراب کرے گا۔ ہم اسلام پر عمل کریں گے...... تب کسی کے لیے نمونہ بنیں گے۔ اگر عمل نہیں...... تو خالی الفاظ سے...... یا...... اسلام زندہ باد کے نعروں سے اسلام نہیں آئے گا۔

آج جج صاحبان انصاف انصاف پکارتے ہیں...... مگر آج

تک انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوئے...... کیوں کہ جج صاحبان خود ڈنڈی مار کر ظلم کرتے ہیں۔ حکومت انسداد رشوت کے لیے قوانین بناتی ہے...... مگر رشوت بڑھتی چلی جارہی ہے...... کیوں کہ اہل قانون خود رشوت خور ہیں۔ آج حکومت کا دعویٰ ہے کہ اسلامی اقدار کی حفاظت ہوگی......، لوگوں کی جان و مال کی حفاظت ہوگی......، قوم کا اعتماد بحال ہوگا......، اسلامی سرحدات کی حفاظت ہوگی......، قوم خواندہ ہوگی...... مگر ان میں سے ایک مقصد بھی آج تک حاصل نہیں ہوا...... کیوں کہ اہل حکومت دوسروں کے لیے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی عملی زندگی نہیں ہے۔ اس لیے اہل اللہ نے عمل کا بہت اہتمام فرمایا ہے۔

کارکن کار بگزر از گفتار
کاندریں راہ کار باید کار
کام کر بس کام چھوڑ باتوں کو
کہ اس راستے میں کام ہی کام چاہیے

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے اور پہلے پہل خطبہ کے واسطے کھڑے ہوئے تو زیادہ حیا کی وجہ سے مضمون کی آمد نہ ہوئی تو فرمانے لگے ﴿اَنْتُمْ اِلٰی اِمَامٍ فَعَّالٍ اَحْوَجُ مِنْهُ اِلٰی اِمَامٍ

قَوَّالٍ وَسَتَاتِيكُمُ الْخَطبُ بَعْدُ "یعنی تم کو کام کرنے والے امام کی زیادہ ضرورت ہے نہ کہ باتیں کرنے والے امام کی۔ بعد میں تم سے خطاب کیا جائے گا۔﴾ مطلب یہ تھا کہ میں ان شاء اللہ کام کر کے دکھاؤں گا خالی باتیں نہ بناؤں گا۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی اس ارشاد میں عمل کی اہمیت پر تنبیہ فرمائی ہے۔ ہمیں بھی اپنے معاملات میں باتوں کو نہیں بلکہ عمل کو ترجیح دینا چاہیے۔ اگر ایک بیٹا زبان سے کہے کہ میں تو باپ کا جوتا ہوں ناک صاف کرنے کا رومال ہوں، مگر عملاً باپ کی بات نہ مانتا ہو تو کیا ایسے بیٹے کو باپ تابع دار کہے گا؟ ہرگز نہیں۔

آج لوگ کثرت کلام کو ہنر سمجھتے ہیں لیکن احادیث سے اس کی مذمت معلوم ہوتی ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ﴿ اَنَّ اللّٰهَ يُبغِضُ الْبَلِيغَ مِنَ الرِّجَالِ "اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے جو تکلف سے اپنے آپ کو فصیح اور بلیغ بناتا" ﴾ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں فرماتے جو بلا ضرورت زیادہ باتیں کرتے ہیں اور بے تکلف اور بے سوچے گفتگو کرتے ہیں۔ کثرت کلام مذموم ہے۔ اس سے دل مردہ ہوتا ہے۔

دل ز پر گفتن بمیر دور بدن گرچہ گفتارش بود دُرِّ عدن

دل زیادہ بولنے سے مرتا ہے اگرچہ اس کے الفاظ عدن کے موتی ہوں

عمل بہ نسبت تقریر کے اس وجہ سے بھی بہتر ہے کہ عمل عامل کا اپنا کردار ہے اس میں کسی کا دخل نہیں اور مقرر تو سامعین کا مرہون منت ہے۔ اگر سننے والے نہ ہوں ...... یا تقریر کو سمجھنے والے نہ ہوں ......تو تقریر کیسے ہوگی؟ سننے والے بوتل کی مانند ہیں ...... اور سنانے والا پیک کی مانند ہوتا ہے......اور تقریر تیل کی مانند۔ اب اگر پیک یہ کہے کہ میں نے تیل پہنچایا یہ اس کی حماقت ہے بلکہ اس کو بوتل کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس کی برکت سے اس کو بھی تیل سے کسی قدر تعلق ہو گیا۔ بہرحال عمل کا اہتمام ضروری ہے۔

قدم باید اندر طریقت نہ دم
کہ اصل ندا در دمے بے قدم

عمل چاہیے شریعت میں، نہ کہ صرف باتیں کیوں کہ
عمل کے بغیر بات بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ (سعدیؒ)

عمل سے لوگ گھبراتے اس لیے ہیں کہ عمل میں مشقت ہوتی ہے۔ اور لوگ راحت پسند ہوتے ہیں۔ مگر اہل اللہ لکھتے ہیں عمل شروع شروع میں مثل دوا کے ہے۔ جس طرح دوا پینا ناگوار لگتا ہے...... ایسی طرح شروع میں عمل بھی ناگوار ہوتا ہے۔ مگر انتہا میں

عمل غذا بنتا ہے۔ جیسے غذا میں لذت ہوتی ہے......اسی طرح منتہی کو عمل میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ جَعَلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوة ''نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔'' اور لذت نہ بھی ہوتی تب بھی عمل قابل اہتمام ہوتا کیوں کہ ہم لذت کے بندے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے بندے ہیں اور عمل سے خدا ملتا ہے۔ اس سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے؟

روز گر رفت گور و باك نيست
تو بمان اے آنکه چوں تو پاك نيست
ذوقیات و احوال نہ ہوں تو دل گیر نہ ہو
خدا تو ہے کہ اس جیسا پاک کوئی نہیں

بلکہ صوفیائے کرام رحمہم اللہ تو لکھتے ہیں کہ ذوقیات کی طرف اگر کسی وقت توجہ ہونے لگے تو لا الہ الا اللہ کے لا سے ان کی بھی نفی کرنی چاہیے کیوں کہ مقصود بالذات تو وراء الوراء ہے۔

فراق و وصل چه باشد رضائے دوست طلب
که حیف باشد از وغیر او تمنائے
دوست کی رضا چاہیے فراق ہو یا وصال
ظلم ہے اس کے علاوہ چاہنا

محبّ وہ ہے کہ محبوب شیرینی کھلائے تو اس پر راضی، پھیکا کھلائے تو اس پر راضی رہے۔

یا تن برضائےء دست نی باید داد
یا قطع نظر زیاری باید کرد

کیا دوٹوک فیصلہ ہے کہ اگر یہ خدا پسند نہیں تو کوئی دوسرا خدا تجویز کرلو جو تم کو ہمیشہ لذت میں ہی رکھے۔ اگر یہی خدا پسند ہے تو وہ تمہاری مرضی کے تابع نہ ہوگا۔

مذکورہ آیات یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ میں اہتمام عمل اس طرح ہے کہ اِصْبِرُوْا سے مراد ذاتی اعمال اور احوال میں صبر مراد ہے۔ جیسے نماز، روزہ،، بیماری وغیرہ اور صَابِرُوْا سے مراد دوسروں کے ساتھ معاملات و محاربات میں صبر مراد ہے۔ یہ دونوں تمہید ہیں اور رَابِطُوْا سے مراد دوام عمل ہے اور یہی مطلوب ہے اور اتَّقُوْا سے مراد تکمیل مقصود ہے اور تُفْلِحُوْنَ سے مراد انجام مطلوب ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ حرص سے بچنے کی اہمیت ﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

وقال رَسُوۡلُ اللّٰہ ﷺ یَقُوۡلُ اِبۡنُ آدَمُ مَالِیۡ مَالِیۡ

(الحدیث) ''ابن آدم کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال''

انسانی حرص کی کوئی حد نہیں۔ حرص حریص کی موت تک برابر ترقی کرتا رہتا ہے۔ حرص ایک بیماری ہے ...... اگر اس کا علاج قناعت سے نہ کیا جائے تو روز افزوں اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حریص کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتا کہ ضرورت پوری ہونے کی ایک خاص حد ہے۔ اس خاص حد سے آگے قدم اٹھانے سے فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ دیکھئے کھانے کی ضرورت پیٹ بھرنے تک ہے۔ اگر ضرورت سے زیادہ کھایا جائے ...... پھر یا تو قے کرنے لگے گا ...... یا اسہال میں مبتلا ہو جائے گا ...... اور رفتہ رفتہ ہاضمہ ایسا خراب ہو جائے گا کہ پھر بدذائقہ دوائیاں کھانی پڑیں گی۔

اگر ایک آدمی دس عظیم الشان محلات بھی تعمیر کر لے ...... تو ایک کمرے سے زیادہ کسی کو استعمال نہیں کرسکتا ورنہ ساری زندگی

حرکت میں گزر جائے گی۔ اگر کوئی سو بستر بھی بنا لے...... مگر سونے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک بستر سے زیادہ درکار نہیں ورنہ نیچے دَب کر مر جائے گا۔ اسی طرح چند جوڑے کپڑے کے آدمی کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ سو سوٹ بنا کر رکھنا فضول ہے۔

ایک کوزے کا ظرف محدود ہوتا ہے اگر اس میں ایک سمندر کو بھی انڈھیل دیا جائے تو بھی کوزے میں بقدر ظرف ہی پانی بھرے گا باقی تمام پانی چھلک کر اِدھر اُدھر گر جائے گا۔ کوزے کو اس سے کیا حاصل......؟ سیپی کے اندر موتی کیسے بنتا ہے......؟ قدیم زمانہ میں لوگوں کا خیال تھا کہ بارش کا ایک قطرہ اس کے منہ میں جاتا ہے پھر اس کا منہ بند ہو جاتا ہے اور قطرہ رفتہ رفتہ موتی بن جاتا ہے۔

عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صدف کے اندر موتی قناعت نے بنایا۔ اگر وہ حرص میں اپنا منہ بارش کے قطروں کے لیے کھلا ہی رکھتی تو کوئی قطرہ بھی موتی نہ بنتا۔ ہاں حیات انسانی کی کشتی کو چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نیچے اتنا پانی ہو جو اس کو بخوبی تیرا سکے۔ اس سے زیادہ مقدار میں پانی کی کشتی کو ضرورت نہیں۔ مقدار سے زیادہ پانی کشتی کے لیے فالتو ہے۔ اسی

طرح ضرورت سے زیادہ مال انسان کے لیے فالتو ہے۔ اور اگر ضرورت سے زیادہ مال کی حرص انسان کے دل میں داخل ہوگئی تو وہ زندگی کی خرابی کا باعث ہوتی ہے۔ جیسے پانی اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو اس کو ڈبو دیتا ہے۔

آب در کشتی هلاك کشتی است
زیر کشتی بهر کشتی پشتی است

ایک انسان کی ضرورت ہے جو ایک روٹی سے بھی پوری ہو جاتی ہے اور ایک ہے انسان کی خواہش جس کے لیے قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ ضرورت پوری ہونے پر قناعت کرے اور خواہشات کے پیچھے نہ پڑے ورنہ ذلیل ہو جائے گا۔

گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پر کند یا خاك گور

یہ انسان کا ظرف اور اس کی قوتیں محدود ہیں ایک حد تک تو آرزو جائز ہے جس سے ایک انسان کو نفع پہنچتا ہے اور دوسروں کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ لیکن نفس پر آرزوؤں کو لادتے چلے جاؤ تو نہ تو وہ پوری ہوسکتی ہیں اور نہ ان سے کوئی مسرت و سعادت حاصل ہو

سکتی ہے۔ انسان کا جسم ایک تنکے کی مانند ہے مگر ہم اس پر آرزوؤں کا پہاڑ لاد لیتے ہیں۔ دیکھیے سورج منبع حیات ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سورج ایک کی بجائے سو ہوں یا زمین اس سے زیادہ قریب ہو۔ سورج کی یہی مقدار اور اندازہ مفید ہے ورنہ عالم بھسم ہو جائے۔ انسان خواہشوں کا ایک متلاطم سمندر ہے۔ حرص و ہَوا کے بندے اس میں ڈوب جاتے ہیں اور صرف وہی شخص تیر سکتا ہے جس نے اپنے باطن کو موہوم امیدوں سے خالی کر دیا ہو۔ عارف رومیؒ فرماتے ہیں کہ درویش کی مثال ایسی ہے کہ ایک خالی گھڑا ہے جس کا منہ بند ہے۔ دریا میں جیسا بھی طوفان برپا ہو وہ اس میں ڈوب نہیں سکتا۔ اس کے اندر بس بے ہوسی کی ہوا ہے جو نفحہ الٰہی بھی ہے۔ شہوات و آفات کا کوئی سمندر ایسے بے ہوس انسان کو ڈبو نہیں سکتا۔

کوہ سر بستہ اندر آب رفت
از دل پر باد فوق آب رفت
باد درویشی چو در باطن بود
بر سر آب جہاں ساکن بود

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

﴿نیک اعمال کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

وقال اللّٰه تعالٰی اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوْا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ط سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ

(پ۲۵۔سورۃ الجاثیہ۔آیت ۲۱) ''جو لوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی، یہ جو دعوے کرتے ہیں برے ہیں۔''

وقال اللّٰه تعالٰی اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (پ۲۳۔سورۃ ص۔آیت ۲۸) ''جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے کیا ان کو ہم ان کی طرح کر دیں گے جو ملک میں فساد کرتے ہیں یا پھر پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے۔''

ان آیات میں اعمالِ صالحہ کی ترغیب دی گئی ہے ۔ ایک اسلامی نظریات ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا عقیدہ، ......انبیاء کرام کی سچائی ......آسمانی کتابوں کی حقانیت ......فرشتوں ...... جنت دوزخ ...... قیامت اور حساب کا ماننا وغیرہ۔ یہ ہیں اسلامی نظریات جن کو مانے بغیر انسان مسلمان نہیں۔ اور ایک اسلامی اعمال ہیں جیسے نماز...... روزہ...... زکوٰۃ...... حج ...... وغیرہ جن کے بغیر اسلام کامل نہیں۔

الحمد للہ! اسلامی نظریات کا اہتمام ہم بہت کرتے ہیں جیسے جان کے نکلنے کو ہم جسمانی موت سمجھتے ہیں...... ایسے ہی اسلامی نظریے کو چھوڑنا ہم ایمانی موت سمجھتے ہیں۔ جیسے مچھلی کے لیے پانی سے نکلنا موت ہے ...... اس طرح اسلامی نظریات سے نکلنا ہم ایمانی موت سمجھتے ہیں مگر اعمال صالحہ کی اہمیت ہمارے دلوں میں اتنی نہیں۔

دیکھئے ہم ایمان کو کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ...... مگر نماز ......اور دوسرے اعمال وغیرہ ہر وقت ...... ہر جگہ...... اور ہر حال میں چھوٹ جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہم کو مندرجہ بالا آیات میں ڈرایا تا کہ ہم نیک

اعمال کا بھی اہتمام کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعمال صالحہ بغیر نظریات کے درست نہیں حتیٰ کہ کوئی شخص توحید مانے بغیر ساری زندگی سجدہ اور روزہ میں گزار دے اور سارا مال بھی صدقہ کر دے تب بھی قبول نہیں مگر اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ اعمال قابل اہتمام نہیں۔ دیکھئے شاخوں کی نشوونما اور گل وثمر جڑوں کے بغیر ناممکن ہے مگر اس کے باوجود جڑوں کی طرح شاخیں بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہیں ورنہ پھل اور پھول کیسے ملیں گے۔ سایہ کہاں ہوگا؟ تو جس طرح نظریات ضروری ہیں ان کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ بھی انتہائی ضروری ہیں۔

معراج کی رات حضورﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ آگ اس کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی مگر اچانک ایک شخص نے آگ کو بجھا کر اس کو بچا لیا اور یہ بچانے والا شخص اس بچائے جانے والے کا روزہ تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ انبیاء کرام علیہم السلام جماعتوں کی شکل میں بیٹھے ہیں ایک چاہتا تھا کہ کسی جماعت میں بیٹھ جائے مگر فرشتے ان کو بیٹھنے نہیں دیتے اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس شخص کو میرے پاس بٹھا دیا۔ یہ بٹھانے والا اس شخص کی نماز تہجد تھی۔ اس سے اعمالِ صالحہ کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اللہ غفور الرحیم ہے اسی لیے گناہوں پر دلیری کرتے ہیں مگراس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم گناہ کرتے رہیں اور وہ معاف کرتا جائے گا۔ بلکہ یہ آیت کریمہ اس شخص کے لیے ہے جس نے ماضی سیاہ کاری میں گزارا ہو...... اوراب صدقِ دل سے توبہ کرنا چاہتا ہو......مگراس کے دل میں اس بات کا کھٹکا ہو کہ اتنے گناہوں کے ساتھ کس منہ سے خدا کے پاس جاؤں۔ ایسے شخص کے لیے ہے کہ شرماؤ مت بلکہ صدقِ دل سے آؤ تو اللہ تعالیٰ تیرے ماضی کے گناہ معاف فرمادے گا۔

اللہ تعالیٰ کے پاس جانے سے حقوق اللہ میں ماضی کی غلطیاں اس طرح دُھل جاتی ہیں جیسے غلاظت میں لت پت آدمی دریا میں جانے سے پاک وصاف ہو جاتا ہے......مگر دریا اس سے ناپاک نہیں ہوتا۔

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ

آپ کا نام کیا ہے؟ تو فرمایا......عبداللہ۔

اور جب پوچھا گیا کہ کس کے بیٹے ہیں؟ تو فرمایا...... ابن الاسلام کا۔

اور جب پوچھا گیا کہ آپ کا لباس کیا ہے؟ تو فرمایا

......تقویٰ۔﴿ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (پ۸۔سورہ الاعراف۔ آیت ۲۶)''اور لباس پرہیزگاری کا وہ سب سے بہتر ہے''﴾

اور جب پوچھا گیا آپ کا ٹھکانا کہاں ہے؟ فرمایا......کہ مسجد نبوی۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

﴿لَوْ كَانَ الْاِيْمَانَ بِالثُّرَيَّا لَنَا وَلَتْهُ اَبْنَاءُ الْفُرِسِ (الحدیث) ''اگر ایمان ثریا ستارے کے پاس ہوتا تو فارس والے حاصل کرتے۔''﴾

اور آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ

﴿سُلَيْمَان مِنَّا مِنْ اَهْلَ الْبَيْتِ اَوْ كَمَا قَال (الحدیث) سلیمان اہل بیت میں سے ہیں۔''﴾

اللہ تعالیٰ ہم کو بھی توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿بقاء اور ارتقاء کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

وقال الله تعالٰى مَنِ اسْتَوٰى يَوْمَانِ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ

''جس کے دونوں دن برابر ہوئے وہ خسارے میں ہیں۔''

اللہ تعالٰی نے خالق ہونے کی حیثیت سے اگر ہمیں وجود عطا کیا ہے تو رب ہونے کے ناطے ہمیں ارتقائی زندگی عطا فرمائی ہے۔ پس ہمیں اگر اپنا وجود اس لیے پسند ہے کہ ہمارے خالق کا عطیہ ہے تو ہمیں اپنی زندگی میں ارتقاء بھی حاصل کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ یہ بھی رب کا عطیہ ہے۔

ارتقاء دو قسم کا ہے ایک مادی...... دوسرا روحانی۔

○ مادی ارتقاء تو ہر کوئی جانتا ہے کہ انسان آغاز میں آتش و باد و آب و خاک کی منزل میں تھا مگر انہی عناصر نے ترقی کر کے غذاؤں کی شکل اختیار کی...... پھر غذاؤں نے مادہ کی شکل اختیار کی...... پھر مادہ انسان کی شکل میں تبدیل ہوا۔ عناصر سے اب تک روح نے

بے شمار شکلیں اختیار کی ہیں اور ہمیشہ بعد میں آنے والی صورت پہلی صورت سے بہتر تھی۔ ایک صورت کے فنا ہونے سے دوسری صورت ظہور میں آتی ہے۔

توازن روزے کہ در ہست آمدی
آتشی یا باد یا خاکی بدی
تیرا وجود اول روز سے ...... آگ باد یا مٹی تھا
گر بدان حالت ترا بورے بقا
کے رسیدے مر ترا این ارتقاء
اگر پہلی حالت میں جمود ہوتا
تو پھر آپ کس طرح معراج پر پہنچتے

عصر جدید کے حکماء کہتے ہیں کہ ارتقاءِ حیات انسان تک پہنچ کر رُک گیا ہے مگر اس کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہے۔ عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مادیت کی وجہ یہ ہے کہ جمادات سے نباتات...... اور نباتات سے حیوان ...... اور انسان تک جو منزلیں زندگی نے طے کی ہیں وہ تو ان حکماء کو نظر آتی ہیں جس طرح خشکی کے سفر میں انسان جن شہروں اور دیہات سے گزرتا ہے وہ صفحہ ہستی پر دکھائی دیتے ہیں لیکن آگے اگر نہر ناپید ہو اور کنارا آ جائے تو پھر

منزلیں کہاں؟ اس طرح انسان کو اب جس عالم کی طرف اپنے مزید ارتقاء میں بڑھنا ہے وہ روحانی عالم ہے، جسمانی اور مکانی نہیں۔

تالب بحر این نشان پایھا است
پس نشانِ پادورن بولا است

دریا کے کنارے تک پاؤں کے نقش ہوتے ہیں
مگر پاؤں کے یہی نقش سمندر میں نہیں

معلوم ہوا کہ نباتات سے روح تک جو فاصلہ زندگی نے طے کیا ہے اس سے ہزار گنا زیادہ فاصلہ روح کے سامنے ہے۔ غرض یہ کہ ارتقاء ایک لامحدود سفر ہے۔ زندگی کا مقصود یہی ہے کہ پرانی صورتیں برابر ترک کرتے ہوئے تازہ بتازہ صورتیں پیدا کی جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے دو دن ایک جیسے ہوں یعنی نیک اعمال میں ترقی نہ ہو وہ گھاٹے میں رہا۔ مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَانِ فَهُوَ مَغْبُوْن ۔ دیکھئے پرانی صورتیں قربان کرنے میں کھجور کا درخت ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ وہ پرانے پتے گرا دیتا ہے تو اس کو تازہ پتے ملتے رہتے ہیں۔

ارتقاء کا منکر اس حبشی کی طرح ہے جو سمجھتا ہے کہ میں اصل فطرت میں سیاہ فام ہوں اور میری سیاہ روئی کا کوئی تدارک نہیں

لیکن ایک خوبرو سفید آدمی کے منہ پر جب سیاہی لگ جاتی ہے تو وہ فوراً اس کو رفع کرنے کا سوچتا ہے۔ جس انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ میں طائر لاہوتی ہوں تو اگر اس کا ایک پَر ٹوٹ بھی جائے پھر بھی وہ پرواز کے لیے بے چین ہو گا مگر زمین پر ہی پھرنے والی مرغی کو پرواز سے محرومی کا کوئی صدمہ نہیں۔ لُبِ لباب یہ ہے کہ زندگی کا اصل میلان ارتقائی ہے۔ ایک حالت پر قائم ہو جانا اور تبدیلی صورت کی تمنا نہ کرنا موت کے مترادف ہے۔

سمجھتا ہے تو رازِ زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ

قال النبی ﷺ اِرْحَمُوْا ثَلَاثًا عَزِیْزُ قَوْمٍ ذَلَّ وَغَنِیَّ قَوْمٍ اِفْتَقَرَ وَعَالِمًا یَلْعَبُ بِهِ الْجُهَّالُ ''تین قسم کے اشخاص قابل رحم ہوتے ہیں ایک وہ جو اپنی قوم میں سرداری رکھتا تھا...... پھر انقلاب روزگار سے ذلیل ہو گیا ہو۔ دوسرا وہ جو امیر تھا...... پھر افلاس میں مبتلا ہو گیا ہو۔ تیسرا وہ عالم جو جاہلوں میں گھر گیا......اور علم کے نا قدر شناس اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔''

عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس طرح انسان کی بھی یہی

حالت ہے۔ یہ جنت سے زمین پر گرا...... مگر ان میں جو اہل بصیرت ہیں ان کو اپنا مقام نہیں بھولا۔ وہ بے تاب ہیں ...... اور کوشاں ہیں کہ اپنا اصلی مقام دوبارہ حاصل کریں۔ ان کو اپنا مسجود ملائکہ ہونا یاد ہے...... کیوں کہ آدم اپنی اصلی حالت میں نیابت الٰہی میں سردار بھی تھے غنی بھی تھے اور ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا "اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے۔"﴾ کی وجہ سے عالم بھی تھے۔ انسان اب تینوں حیثیتوں سے گر گیا ہے۔ جیسے ہم جسمانی منزلیں طے کرتے وقت ترقی کرتے ہیں ماں کے پیٹ میں...... پھر دنیا اور شیر خواری ہے...... اور پھر دودھ چھڑایا گیا تو ہزار قسم کے طعام ملنا شروع ہو گئے۔ اسی طرح دنیا سے برزخ ہے...... اور برزخ سے آخرت...... بشرطیکہ ہم اس کی تیاری کریں۔ ہمارے دو دن ایک جیسے نہ ہوں......، آج کے گناہ کل نہیں ہونے چاہئیں......، آج کی طرح غفلت والی نماز کل نہیں ہونی چاہیے......، اگر آج ہم صرف پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں تو کل اشراق بھی پڑھنے والے ہوں......، اگلے دن چاشت بھی پڑھنے والے ہوں ...... اور پھر اوّابین بھی پڑھنے والے ہوں......، پھر تہجد بھی پڑھنے والے ہوں......، پھر قرآن خوان ہوں......، ہر آنے والے دن رات دین

کے اعتبار سے ہماری ترقی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ ترقی نصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿تعلق مع اللہ کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (پ۱، البقرۃ، آیت۳۱) ''اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل۔''

انسانی روح اور گناہ دونوں ہم جنس نہیں۔ بلکہ انسانی روح اور مادی نعمتیں بھی ہم جنس نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مادی نعمتوں سے روح کو سکون نہیں ملتا۔ بہت سے لوگ نعمتوں میں پلے پریشان ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی روح کو موافق غذا نہیں ملتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ روح کی خوشی اپنے سے اعلیٰ چیز کے ملنے سے ہوتی ہے اور دنیا کی تمام نعمتیں روح سے کم قیمت والی ہیں۔ روح سے قیمتی بس اس کا خالق ہے۔ اسی وجہ سے خالق کے ساتھ تعلق سے روح کو سکون ملتا ہے۔ ﴿ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (پ۱، البقرۃ، آیت۳۱) ''اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل۔'' ﴾ اور چوں کہ دنیا کی مادی نعمتیں اور انسانی روح ہم جنس نہیں اس لیے دنیا سے

روح کا تعلق پریشانی کا باعث بنتا ہے کیوں کہ ناجنسوں کی صحبت فائدے کی بجائے نقصان پہنچاتی ہے۔

مثنوی کے سبق آموز قصوں میں ایک قصہ مینڈک اور چوہے کی دوستی کا ہے۔ مینڈک پانی پر بھی رہ سکتا ہے اور خشکی پر بھی جب کہ چوہا صرف خشکی کا جانور ہے۔ فرماتے ہیں ناجنسوں کی دوستی کی بنیادیں قوی نہیں ہوتیں۔ یوں ہی دفع الوقتی اور تفریح کے لیے یا کسی وقتی منفعت کے لیے۔ کچھ عرصہ تک دوستی کا اظہار بھی کریں تو کسی مصیبت کے وقت اپنی اپنی راہ لیں گے۔ چناں چہ مچھلی اور پانی کی رفاقت کو دیکھو۔ مچھلی کے لیے پانی سرچشمہ حیات ہے لیکن چوں کہ پانی اور مچھلی کی جنس جدا جدا ہے اس لیے ماہی گیر جب پانی میں جال ڈالتا ہے تو مچھلی اس کے اندر گرفتار ہو جاتی ہے اور اس کا دوست پانی جال کے سوراخوں سے صاف نکل جاتا ہے گویا کبھی مچھلی سے آشنائی ہی نہ تھی۔

صحبت ناجنس گر جان بخشدت ایمن مباش

آب رادیدی کہ ماہی را بدام افگند و رفت

گھر سے..... دکان سے..... فیکٹری سے..... صنعت و تجارت سے..... انسان کا تعلق اسی طرح ہے۔ ساری زندگی ان

چیزوں میں رہنے کے باوجود جب موت آئے گی ...... تو ملک الموت ہم کو مچھلی کی طرح دنیا سے نکال کر قبر میں اتارے گا۔ معلوم ہوا یہ تمام چیزیں ناجنس ہیں اس لیے باقی نہیں رہیں۔ روح کے ہم جنس اعمال صالحہ ہیں جو ساتھ جاتے ہیں ﴿وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (پ۱۵، سورۃ الکھف، آیت ۴۶)
"اور باقی رہنے والی نیکیوں کا بہتر ہے تیرے رب کے ہاں بدلہ اور بہتر ہے توقع۔"﴾

چناں چہ مینڈک اور چوہے کی دوستی کا بھی یہی انجام ہوا جب تک کوئی مصیبت کا سامنا نہ تھا مینڈک کنارے پر آ کر چوہے سے خوش گپیاں کرتا تھا۔ چوہے نے کہا کہ یار میں تو پانی میں نہیں جا سکتا مگر تو خشکی پر آ سکتا ہے۔ اگر میں تجھ کو پانی کے اندر سے بلانا چاہوں تو اس کی کیا ترکیب ہو سکتی ہے؟ چوہے نے یہ تجویز دی کہ ایک رسی کے ذریعے ہم رشتہ اخوت استوار کر لیتے ہیں۔ تم یہ رسی اپنی ٹانگ سے باندھ لو اور ادھر میں اپنی دم سے باندھ لیتا ہوں۔ ایک دوسرے سے ملاقات سے خواہش ہو تو رسی کو جھٹکا دے دیں گے۔ بری تقدیر سے ایک کوے نے چوہے کو غافل پا کر پکڑ لیا اور اس شکار کو لے کر ہوا میں اڑنے لگا۔ چوں کہ رسی مینڈک کے ٹانگ

سے بھی بندھی ہوئی تھی اس لیے وہ بیچارہ بھی مفت میں گرفتار ہو کر ہوا میں معلق ہو گیا جس سے کوے کو ایک کی بجائے دو شکار ہاتھ آگئے اس سے معلوم ہوا کہ ناجنس کی صحبت ضرور آخر کار مصیبت کا باعث ہو گی۔

چون برآمد بر ہوا موش از غراب
منسحب شد چغز نیز از قصر آب

اس قصہ میں عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ جسمانی خواہشوں کو چوہے سے تشبیہ دیتے ہیں...... اور روح کو مینڈک سے، جو خشکی اور پانی دونوں جگہ پر زندہ رہ سکتا ہے۔ جسمانی خواہشات کی وجہ سے انسان دنیا کے کووں اور کتوں کا شکار ہوتا رہتا ہے خصوصاً اس حالت میں کہ اس نے اپنی روح کو جسمانیت سے اس طرح وابستہ کر رکھا ہے جس طرح مینڈک نے اپنی ٹانگ چوہے کی دُم سے باندھ دی تھی۔

آج ہمارے تعلقات گناہوں کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ کوئی فلم کا دوست ہے...... کوئی جوئے کا...... ، کسی سے سودی کاروبار ہے...... کسی سے رشوت لینا دینا ہے۔ جب ایک جہنم میں جائے گا...... تو دوسرا بھی ساتھ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تعلق باللہ اور تعلق لِلّٰہ نصیب فرمائے۔

گناہوں سے بچنے کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

(پ۱۳، الرعد، ۱۱) ''بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں جو ان کے نفسوں میں ہیں۔''

گناہوں کے دو اسباب ہیں اور دو سزائیں۔ گناہوں کا ایک سبب غرور اور تکبر ہوتا ہے جیسے اہل حق کا قتل، حق وصداقت کا انکار۔ دوسرا سبب سستی اور غفلت جیسے شہوات میں مگن ہو کر ترک صلوٰۃ، ترک صوم وغیرہ۔ گناہوں کی سزا بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک کا نام ہے خسرانی سزا اور دوسری حرمانی سزا۔

گناہ اگر پہلی قسم کے ہوں تو سزا بھی پہلی قسم کی ہو گی اور گناہ اگر دوسری قسم کا ہوگا تو سزا بھی دوسری قسم کی ہو گی۔ قوم نوح کے گناہ تکبر پر مبنی تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر خسرانی عذاب طوفان کی شکل میں مسلط فرمایا۔ قوم نے تکبر کیا ان کے مقابلے میں پانی نے

سر اٹھا کر ان کا سر نیچا کیا اور قوم کے افراد کو ڈبو دیا اس لیے یہ خسرانی عذاب ہوا۔ ﴿فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (پ۲۰، العنکبوت، آیت۱۴) ''پھر پکڑا ان کو طوفان نے اور وہ گنہگار تھے۔''﴾ اس طرح قوم فرعون پر بھی پانی کا عذاب آیا۔ ﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ (پ۹، سورۃ الاعراف، آیت۱۳۳) ''پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان۔''﴾ اور اگر گناہ کا سبب سستی اور غفلت ہو تو عذاب حرمانی ہوگا۔ ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَاءٍ مَّعِيْنٍ (پ۲۹، الملک، آیت۳۰) ''تو کہہ دیکھو تو اگر ہو جائے صبح کو پانی تمہارا خشک پھر کون ہے جو لائے تمہارے پاس پانی بہتا۔''﴾ یہ تو پانی کے ذریعے حرمانی عذاب تھا۔

اللہ تعالیٰ کبھی کبھی خاک کے ذریعے خسرانی حرمانی سزائیں دیتا ہے۔ قارون متکبر تھا اللہ تعالیٰ نے زمین کو متکبر بنا کر قارون کو اس میں دھنسا دیا اسی طرح قوم لوط کی بھری بھرائی بستیاں زمین برد کی گئیں اور زمینی اجزاء ان پر برس پڑے۔ ﴿اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا (پ۱۵، بنی اسرائیل، ۶۸) ''کیا تم بے ڈر ہو گئے اس سے کہ دھنسا دے تم کو جنگل کے کنارے یا بھیج دے تم پر آندھی پتھر

برسانے والی پھر نہ پاؤ گے اپنا کوئی نگہبان۔" ﴾ اور کبھی زمین کے ذریعے حرمانی سزائیں دیتا ہے ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْ تَزُوْلَا ﴾۔ اسی طرح ہوا کے ذریعے اللہ تعالیٰ خسرانی سزائیں دیتا ہے۔ ﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُھْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَةٍ (پ۲۹۔ الحاقہ۔٦) "اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے۔" ﴾ اور کبھی حرمانی سزائیں دیتا ہے۔ ﴿اِنْ یَّشَاْ یُسْکِنِ الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَھْرِہٖ (پ۲۵، الشوریٰ، ۳۳) "اگر چاہے تھام دے ہوا کو پھر رہیں سارے دن ٹھہرے ہوئے اس کی پیٹھ پر۔ ﴾ اسی طرح آگ کے ذریعے خسرانی اور حرمانی سزائیں ہیں ﴿ فَاَصَابَھَا اِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ (پ۳، البقرۃ، ۲٦٦) "تب آپڑا اس باغ پر ایک بگولا جس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل گیا۔" ﴾ یہ خسرانی سزا ہے اور ﴿قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیْکُمُ اللَّیْلَ سَرْمَدًا (پ۲۰، القصص، ۷۱) " تو کہہ دیکھو اگر رکھ دے اللہ تم پر دن ہمیشہ کو۔" ﴾ یعنی سورج جو کہ تمام حرارتوں کا مرکز ہے آنے نہ دیں گے۔

غرض عناصر اربعہ کے ذریعے عذاب آنے کی دو صورتیں ہیں ایک طوفانی صورت ہے جس میں ان کی زیادتی ضرر پہنچاتی ہے اور ایک نقصانی صورت ہے جس میں ان کی محرومی کر دی جاتی ہے۔

پس ایک خسرانی عذاب ہوتا ہے اور ایک حرمانی۔ اگر مجرم قوم کے ذنوب کا منشاء ڈھٹائی ہو تو ان عناصر سے عذاب الٰہی طوفانی رنگ میں آتا ہے اور اگر ذنوب کا منشاء سستی اور غفلت ہو تو ان عناصر سے عذاب الٰہی نقصانی رنگ میں آتا ہے تا کہ ﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (پ۲۵، الشوری، ۴۰) ''اور برائی کا بدلا ہے برائی ویسی ہی۔''﴾ کا یہاں اور وہاں پورا پورا ظہور ہو جائے۔

پس جس نوعیت کا تغیر آدمی اپنے نفس اور اعمال میں کرے گا افراطی ہو یا تفریطی اس نوعیت کا تغیر اس کے لیے جہانوں میں ہو جائے گا۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (پ۱۳، الرعد، ۱۱) ''بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں جو ان کے نفسوں میں ہیں۔''﴾ کہ جیسا کرو گے ویسا ہی تمہارے سامنے آ جائے گا۔

اسی کی طرف قرآن حکیم نے مختلف نوعیّتوں سے اشارہ فرمایا ہے۔ کہیں فرمایا کہ اگر تم سعی و عمل سے حق کے کاموں میں مددگار ہو جاؤ گے تو حق تمہارا مددگار ہو جائے گا۔ ﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (پ۲۶، محمد، ۷) ''تم مدد کرو گے اللہ کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔''﴾ اور اگر تم نے حق کا مقابلہ کیا اور حق سے ہٹ کر بے اصل کی

طرف لوٹ پڑے تو حق بھی تمہیں سزا دینے کی طرف لوٹ پڑے گا۔ ﴿ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ (پ۹، انفال، ۱۹) ''اور اگر پھر یہی کروگے تو ہم بھی پھر یہی کریں گے۔'' ﴾ ﴿ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا (پ۱۵، بنی اسرائیل، ۸) ''اُمید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے اور اگر تم پھر وہی حرکتیں کروگے تو ہم بھی وہی سلوک کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے۔'' ﴾

انسان کی خرابی سے عناصر میں خرابی کیوں پیدا ہوتی ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ساری مخلوق ایک گول دائرہ ہے اور انسان اس دائرے کی بیچ و بیچ کا مرکزی نقطہ ہے اور دائرے اور مرکزی نقطہ میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اگر دائرے میں سکڑ پن پیدا ہو تو عین مرکز بن جائے گا اور اگر مرکزی نقطہ میں پھیلاؤ پیدا ہو جائے تو عین دائرہ بن جائے گا اس طرح مرکز کے ثابت ہونے کی صورت میں دائرہ درست رہتا ہے اور مرکز کے ہل جانے کی صورت میں دائرہ سیدھا نہیں رہتا اس وجہ سے انسان جب تک دین پر ثابت قدم رہے گا تو اس سے چاروں عناصر کا دائرہ درست رہے گا۔ زمین بھی فائدہ دے گی ہوا بھی، آگ اور پانی بھی۔ اور اگر انسان دین سے ہٹ

جائے تو تمام عناصر اپنی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔ زمین میں زلزلہ ہوگا ہوا میں طوفانی شکل ہوگی پانی اور آگ میں طغیانی آئے گی۔

كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ ''جیسا کروگے ویسا بھروگے۔''

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ دین کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

وقال اللہ تعالیٰ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (پ۳۰،الغاشیۃ) ’’تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو اور آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔‘‘

فلاح وکامیابی مطلوب عام ہے۔سب ہی اپنی فلاح و بہبود چاہتے ہیں۔اور اللہ پاک بھی ہمیں کامیاب ہونے کا حکم دیتے ہیں فرق اتنا ہے کہ ہم فلاح وکامیابی کو دنیا کی چیزوں میں تلاش کرتے ہیں اور اللہ پاک بتاتے ہیں کہ فلاح کا راستہ دین ہے۔ دین کو اختیار کرو گے تو فلاح ملے گی۔ مذکورہ آیت میں دو دعوے ہوئے ہیں۔ایک تو یہ کہ تم لوگ ترجیح دے رہے ہو دنیوی زندگی کو آخرت پر۔دوسرے یہ کہ اس سے فلاح حاصل نہ ہوگی۔

پہلا دعوی ہمارے شب و روز کے معاملات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ ہم ہر وقت دنیا ہی میں منہمک اور اسی کی دھن میں

لگے ہوئے ہیں یہاں تک دین سے بے تعلقی ہے کہ اگر دین کو اختیار کرتے بھی ہیں تو اس میں دنیا کی آمیزش ہوتی ہے۔قرآن پڑھیں گے کاروبار کی برکت کے لیے...... نہ کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے۔ بزرگوں کے پاس جائیں گے ...... مگر اس لیے کہ کاروبار کے لیے وظیفہ بتائیں ...... نہ کہ اپنی اصلاح کے لیے۔ حالاں کہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ دنیا میں بھی دین کی شان ہوتی۔چناں چہ اہل ایمان کی شان کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءَ الزَّكٰوةَ (پ۱۸، النور، ۳۷) ''وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوۃ دینے سے۔''﴾

تجارت تو اس کو کہتے ہیں جو بڑا کاروبار ہو...... اور بیع اس کاروبار کو کہتے ہیں خواہ چھوٹا ہو خواہ بڑا۔یعنی مطلب یہ ہے کہ نہ بڑا معاملہ ان کو ذکر اللہ تعالیٰ سے غافل کرتا ہے اور نہ چھوٹا معاملہ ان کو ذکر اللہ تعالیٰ سے غافل کرتا ہے۔

رہی دوسری بات کہ دنیاوی چیزوں میں کامیابی نہیں سو اس کی وجہ یہ ہے کہ کامیابی نام ہے راحتِ قلب کا اور قلبی راحت دنیا

داروں کو میسر نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا دار اپنے مقاصد خود متعین کر لیتے ہیں پھر اس کے لیے اسباب تلاش کرتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ دنیاوی اسباب سے مقاصد کا حصول یقینی نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص تجارت کرے گا اس کو مال بھی ملے گا ......کیوں کہ کاروبار میں گھاٹا بھی تو ہوسکتا ہے اور جب کاروبار کے باوجود کمائی نہ ملی ......کوٹھی بنی ......نہ دکان ......نہ فیکٹری ......تو اب پریشانی شروع ہوگئی۔ راحت قلب سلب ہوگئی کیوں کہ امیدوں کا پورا نہ ہونا پریشانی ہے۔ بخلاف اہل دین کے کہ ان کا اصل مقصد صرف آخرت ہے اور اس کے لیے اسباب تلاش کرتے ہیں اور اخروی اسباب بھی یقینی ہوتے ہیں اور ان سے آخرت کا حصول بھی یقینی ہے۔ ﴿ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ (پ۱۵، بنی اسرائیل،۱۹) ''اور جس نے چاہا آخرت کا گھر۔'' ﴾

یہ ممکن نہیں کہ کوئی نماز پڑھے ......اور اللہ تعالیٰ خوش نہ ہوں یا کوئی اسلام لائے ......اور جنت نہ ملے بشرطیکہ اسلام پر تا موت قائم رہے۔ تو اس طرح اہل دین کی تمام امیدیں پوری ہو جاتی ہیں اور امیدوں کا پورا ہونا فلاح و کامیابی ہے جن میں راحت قلبی ہے اور اہل دین کا مقصد بھی اعلیٰ ہے کیوں کہ آخرت کی نعمتیں دنیاوی

نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى اور آخرت پائیدار بھی ہے اس وجہ سے
وَّاَبْقٰى فرمایا یعنی اخروی نعمتیں کیفاً بھی بہتر ہیں کماً بھی بہتر ہیں۔

مگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ قرآن دنیا چھڑا رہا ہے کیوں کہ اس مقام پر تؤثرون فرمایا ہے تطلبون یا تکسبون ارشاد نہیں فرمایا یعنی یہ نہیں فرمایا بل تطلبون الحیوۃ الدنیا کہ تم حیات دنیا کو طلب کرتے ہو یا تکسبون الدنیا یا دنیا کماتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تم ترجیح دیتے ہو حیات دنیا کو آخرت پر کہ آخرت چھوڑ کر دنیا کو حاصل کرتے ہو۔ مثلاً ایک شخص کی جیب میں اشرفی بھی ہے اور پیسے بھی۔ اس پر اس کو ملامت نہیں کیا جائے گا کہ تم نے اشرفیوں کے ساتھ پیسے کیوں حاصل کیے ہیں لیکن اگر وہی شخص جیب سے اشرفی نکال کر پھینک دے اور ان کی جگہ جیب میں پیسے بھرے اس پر اس کو ملامت کیا جائے گا کہ اشرفیوں کو چھوڑا اور پیسے کو حاصل کیا اس طرح یہاں سمجھ لیجیے کہ دنیا طلب کرنے پر اور کمانے پر ملامت نہیں ہوگی بلکہ ملامت ترجیح پر ہوگی۔

اب ہم اپنا اپنا امتحان لیں کہ مال و دولت میں ہم سے آخرت ترک ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ہوتی ہے ایسی دنیا قابل احتراز

ہے اور اگر نہیں ہوتی تو وہ حلال ہے جیسے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

گرت مال و زر هست زرع و تجارت

جو دل با خدا است خلوت نشینی

غرضِ دنیا کو قلب سے نکالنے کے لیے

ہاتھ سے دنیا کو نہ نکالے

آب در کشتی هلاك کشتی است

زیر کشتی بهر کشتی پشتی است

جب دنیا کی محبت دل میں نہیں رہے گی تو ہم غنی ہو جائیں گے۔

﴿اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْس ''اصل غنا دل کا غنی اور مطمئن ہونا ہے۔''﴾ اسی کو تارک الدنیا کہتے ہیں اور دنیا کی محبت دل میں گھسے گی تو ہم محتاج اور فقیر ہوں گے۔ آج ہم تارک الدنیا نہیں کیوں کہ دنیا کی محبت ہمارے دِلوں میں ہے بلکہ ہم متروک الدنیا ہیں دنیا نے ہم کو چھوڑا ہے۔ تارک الدنیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ مال کے باوجود دل میں اللہ تعالیٰ ہی کی محبت رہتی تھی اور مال سے ذرا بھی محبت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی مین سو سو اونٹ ذبح کر کے مساکین میں تقسیم فرماتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منجانب حق پوچھا گیا کہ

آپ ﷺ کہیں تو آپ ﷺ کے لیے احد پہاڑ کو سونا کر دیں اور آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ رہا کرے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یا اللہ مجھے تو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ہو تو کھا کر آپ کا شکر بجا لاؤں اور جب نہ ہو تو آپ سے مانگوں۔ تو آپ ﷺ تارک الدنیا تھے اور تارک الدنیا غریب نہیں ہوتا بلکہ غریب متروک الدنیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تارک الدنیا بنائے متروک الدنیا نہ بنائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿طلب جنت کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

قال اللہ تعالیٰ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

(پ۳۰،النازعات،۴۰) ''اور جو کوئی ڈرا ہوا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس نے جی کو خواہش سے سو جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔''

اس آیتِ کریمہ میں حق تعالیٰ شانہٗ ایسی چیز کے حاصل کرنے کا طریقہ بتاتا ہے جس کا ہر شخص خواست گار ہے مگر کسی چیز کی خواہش معتبر تب ہوتی ہے جب اس کے ذرائع میں بھی کوشش ہو جائے۔ مثلاً کوئی مال دار ہونا چاہے مگر جب اس سے کہیں کہ تم کاروبار سیکھ لو پھر تجربہ کار بن کر کام شروع کر دو اور خرچ آمدن سے کم رکھو اور وہ ان کاموں میں سے کسی کام کے لیے تیار نہ ہو تو ایسے شخص کو مال کا طالب نہیں بلکہ ابوالہوس کہتے ہیں۔ یا کوئی شخص جامع مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے مگر گھر سے نہیں

نکلتا جو ذریعہ ہے مسجد تک پہنچنے کا تو کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ شخص ثواب کا طالب ہے؟

ایک آدمی چاہتا ہے کہ میری زمین میں ہری بھری فصل ہو...... مگر بیج نہیں بوتا...... پانی نہیں دیتا...... رکھوالی نہیں کرتا...... تو یہ شخص احمق ہے اور غلّہ کا طالب نہیں۔ اسی طرح ایک آدمی اولاد چاہتا ہے...... مگر نکاح اور اس کے لوازمات سے انکاری ہے تو کب اولاد ہو سکتی ہے۔ کھانا کھائے بغیر پیٹ کیسے بھر سکتا ہے؟ غرض طالب اگر ذرائع اختیار کرے تو طالب ہے ورنہ ابوالہوس ہے۔

اب تعجب یہ ہے کہ یہ قاعدہ دنیاوی امور میں ہر کس و ناقص، عالم جاہل اور چھوٹے بڑے کے نزدیک مسلّم ہے اور جب دین کا معاملہ آ پڑتا ہے تو بڑے بڑے عقلاء احمق بن جاتے ہیں وہاں جنت کی زبانی طلب کو ہی طلب کہنے لگتے ہیں اور اطمینان رہتا ہے کہ بڑے طالب ہیں۔ اگر ایسا ہے تو زبان سے اولاد اولاد کہنے والے کو بھی طالب الولد کہنا چاہیے اور امید رکھنی چاہیے کہ اس کی اولاد ہو گی۔ عجیب بات یہ ہے کہ دنیاوی چیزوں میں تو اسباب کو دخل ہو اور اُخروی چیزوں میں اسباب کو دخل نہ ہو بلکہ معاملہ برعکس ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی اسباب کو اتنا دخل اپنے مقاصد میں

نہیں ہے جتنا کہ اسباب آخرت کو مقاصد آخرت میں ہے۔ دیکھئے آگ دنیاوی سبب ہے جلانے کا...... اور چھری سبب ہے کاٹنے کا ......اور پانی سبب ہے آگ بجھانے کا...... مگر نار نمرود ابراہیم علیہ السلام کو نہ جلاسکی،...... ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ کی چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے کو نہ کاٹ سکی...... دریائے نیل کا پانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ ڈبو سکا...... جبکہ فرعون نیل میں ڈوب کر آگ میں پہنچا أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا

معلوم ہوا کہ اسباب دنیوی پر نتیجہ کی ترتیب ضروری اور دائمی نہیں۔ ہاں آخرت کے اسباب پر جنت کا ترتب یقینی ہے۔ ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُوْرًا (پ۱۵، بنی اسرائیل، ۱۹) ''اور جس نے چاہا آخرت کا گھر اور کوشش کی اس کے واسطے جو اس کی کوشش ہے اور وہ یقین پر ہے سو ایسوں کی کوشش ٹھکانے لگی ہے۔'' ﴾ یعنی جو کوئی آخرت کا طالب ہوا اور کوشش کرے تو اس کی سعی ضائع نہیں جائے گی بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فَنَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ (پ۲۵، الشوریٰ، ۲۰) یعنی اس کا نتیجہ بقدرِ عمل ہی نہیں بلکہ زیادہ دیا جائے گا اور دنیاوی مقاصد کا ترتب دنیاوی اسباب پر غیر یقینی ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے ﴿ مَنْ كَانَ

يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (پ۱۵، بنی اسرائیل، ۱۸) ''جو کوئی چاہتا ہو پہلا گھر جلد دے دیں ہم اس کو اسی میں جتنا چاہیں جس کو چاہیں۔'' ﴾ کہ دنیاوی مقاصد طالب کی منشاء کے مطابق نہیں بلکہ اللہ پاک کی مرضی کے مطابق ملتے ہیں اس لیے ما نشاء کا لفظ بڑھایا اور وہ بھی ہر کسی کو نہیں بلکہ جس کو اللہ پاک دینا چاہے اس لیے لمن نرید فرمایا دیا۔ لہٰذا ہمیں صحیح معنوں میں طالبِ جنت بننا چاہیے۔

طالبِ جنت دو قسم کے ہیں ایک وہ جو جنت کی جنتی چیزوں کو مقصود خاطر سمجھیں مثلاً وہاں کے مکانات، دلکش پر فضا باغ و بہار کی خاطر جنت کو چاہتے ہیں دوسرے وہ لوگ ہیں جو جنت کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے لیے طلب کرتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے طالب ہیں مگر ان کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دیدار جنت میں ہوگا اس لیے چاہتے ہیں کہ جنت میں پہنچ جائیں تا کہ مقصود اصلی حاصل ہو جائے۔ غرض نعمت کے طالب نہیں منعم کے طالب ہیں۔

بعض گمراہ لوگ جو نہ نماز پڑھتے ہیں نہ دوسرے ارکان پورے کرتے ہیں اور گناہوں سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا کہتے ہیں کہ

ہمیں جنت کی ضرورت نہیں اس لیے اعمال نہیں کرتے ہم اللہ تعالیٰ کے طالب ہیں۔ یہ احمق نہیں سمجھتے کہ پھر تو ان کو زیادہ محنت کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو جنت سے زیادہ اعلیٰ وارفع ہیں۔ بہرحال جنت اصلاً یا تبعاً مقصود بنی۔ اس مقصود کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

وہ اللہ پاک نے دو چیزیں بتائی ہیں۔ ایک اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف دوسرا وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى۔ ان دو چیزوں میں تمام نیکیاں بھی آ گئیں اور تمام گناہوں سے بچنا بھی آ گیا۔ اور یہی راستہ ہے جنت تک پہنچنے کا۔ نیکی وہ چیز ہے کہ بھولے سے بھی کی جائے تو اثر رکھتی ہے جیسے سفید کپڑا بھولے سے بھی رنگ میں گر جائے تو دھبے ضرور پڑ جاتے ہیں لہٰذا ہم ہر حال میں نیکی کریں۔ اللہ پاک ہمیں نیکی کی توفیق عطا فرمائے اور جنت میں اپنا پڑوس نصیب کرے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿تطہیرِ باطن کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ

کلمہ طیبہ کے تین جز ہیں۔ پہلے جز کا مقصد تطہیر باطن ہے یعنی اپنے دل و دماغ کو غلط عقائد سے...... غلط اخلاق سے...... غلط جذبات سے ...... غلط معاملات سے...... اور غلط معاشرت سے پاک کریں۔ لا کا جھاڑو پھیر کر اندر کو صاف کریں جیسے برتن کو قلعی کرنے سے پہلے اس کو زنگ سے صاف کرتے ہیں یا دیوار کو رنگ کرنے سے پہلے اس کے دھبے صاف کرتے ہیں یا کپڑے کو رنگ کرنے سے پہلے اس کے دھبے دھو ڈالتے ہیں یا تختی پر لکھنے سے پہلے اس کا لکھا ہوا دھو ڈالتے ہیں۔

لا کا مقصد ہے کہ اندر سے غیر اللہ کو نکالو یہاں تک کہ بارش کی امید آسمان سے نہ ہو...... برسات کے بادل سے نہ ہو...... بلکہ اللہ تعالیٰ شانہ سے ہو۔ فصل زمین سے اُگنے کا یقین نہ ہو...... بلکہ

اللہ پاک سے ہو۔ یہاں تک یقین آجائے کہ اگر آسمان تانبے کا بنا ہوا ہے اب ایک قطرہ بھی بارش نہیں برسائے گا اور زمین پتھر کی بنی اب ایک دانہ بھی نہ اُگائے کی تب بھی رزق کے معاملے میں ان سے پریشان نہ ہوں کیوں کہ رازق نہ آسمان ہے اور نہ زمین ہے بلکہ کوئی اور ذات ہے اور وہ اللہ پاک ہے۔

دوسرا جز ہے اِلَّا اللّٰہ اس کا مقصد ہے تعمیر الباطن یعنی ہم اپنے دل کو صحیح عقائد سے صحیح اخلاق سے اور صحیح اعمال کے صحیح جذبات سے آراستہ کریں جیسے برتن کو صاف کرنے کے بعد قلعی کر دیتے ہیں یا دِیوار اور کپڑے کو صفائی کے بعد رنگ دیتے ہیں یا تختی پر دھونے کے بعد نیا خط لکھتے ہیں یہاں بھی یہ کریں کہ شرکیہ عقائد چھوڑ کر توحید پر مبنی عقائد اپنالیں۔رسوم و بدعات چھوڑ کر سنت نبوی ﷺ سے اپنے آپ کو آراستہ کرلیں اور جب ان کے باطن کی تطہیر ہو جائے گی تو ظاہر کی خود بخود ہو جائے گی کیوں کہ باطن ظاہر کی نسبت زیادہ قابل اہتمام ہوتا ہے۔ دیکھئے پھل کا باطن مغز چھلکے سے زیادہ اہم ہے اور باطن کا روغن مغز سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ مکان کی بنیادیں ظاہری دیواروں سے مقدم ہوتی ہیں اور شاخوں سے درخت کی جڑیں زیادہ مضبوط ہونی تصور کی جاتی ہیں۔ باطن نہ

بنا تو ظاہر کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہماری غلطی ہے کہ ہم صرف ظاہر پر توجہ دیتے ہیں۔

ایوانِ صدر کو خوب پختہ اور وسیع بنائیں گے...... مگر اندر صدر اُلو بٹھائیں گے، عدالت کی عمارت لمبی چوڑی بنائیں گے...... مگر اندر کا جج اُلو ہوگا۔ اگر پنجرہ سونے کا بنا ہوا ہو...... مگر اندر کوا ہو تو کس کام کا؟ نیام سونے کا ہو...... مگر اندر تلوار لکڑی کی ہو یا گھڑا سونے کا ہو...... مگر اندر پیشاب ہو تو کوئی قریب بھی نہ جائے۔ اسلام کہتا ہے کہ جھونپڑی میں رہو مگر رہنے والا صدر اور جج انسان ہونا چاہیے...... نہ کہ بندر۔

تیسرا جز ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ ۔اس جز کا مقصد ہے تعمیل باطن۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی تطہیر اور تعمیر باطن میں جذبات کی بجائے محمد ﷺ کی تعمیل کریں۔ انسانی اعمال کورا کاغذ ہیں اور آپ ﷺ کی موافقت سرکاری مہر ہے۔ کورا کاغذ ہو اس کے بدلے سودا نہیں ملتا۔ سرکاری مہر لگنے کے بعد وہ نوٹ بن جاتا ہے اور آپ اس سے ہر سودا خرید سکتے ہیں۔ اس طرح جو عمل سنت کے مطابق نہ ہو اس کے بدلے جنت نہیں ملے گی اور جب سنت کے مطابق ہوگا تو اس سے ہر سودا خریدا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ پہلے تطہیر ہو ...... پھر تعمیر بھی کریں اور پھر تکمیل بھی کریں کیوں کہ تطہیر نہ ہو تو ہم زنگ آلود برتن اور دھبے لگے کپڑے کی مانند بے قیمت ہوں گے۔ تطہیر ہو ...... مگر تعمیر نہ ہو تو ہم خالی تختی کی مانند غیر مفید ہوں گے۔ اور دونوں ہوں ...... مگر تکمیل سنت نہ ہو تو ہم کورے کاغذ کی طرح کوئی مقام حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اللہ پاک ہمیں اپنے باطن کو بنانے کی توفیق عطا فرمائے ہمیں ایسا بنائے کہ ہم اُسے پسند آ جائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿عبادات میں روح کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا
مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ

اسلام کی جو عبادتیں ہیں ان کی اگر چہ ایک ظاہری شکل ہے مگر اسی کے ساتھ ان کی ایک روح ہے۔ اور تمام عبادتیں اپنی اسی روح کے اعتبار سے مطلوب ہیں نماز کی روح تواضع ہے۔ نماز میں اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کہنا اور پھر سجدہ میں گر کر زمین پر اپنا سر رکھ دینا اس بات کا اقرار ہے کہ تمام کائنات میں ساری بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے بندہ کے لیے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو جھکا دے یہ اقرار آدمی کے اندر تواضع کا مزاج پیدا کرتا ہے اور یہ سبق دیتا ہے کہ مسجد سے نکل کر جب وہ انسانوں کے درمیان آتا ہے تو ان سے معاملہ کرنے میں اس کا انداز تواضع کا ہوتا ہے نہ کہ غرور اور گھمنڈ کا۔

زمین چوں کہ پست پیدا کی گئی ہے تو اس کی عزت پست

رہنے میں ہے اگر ہوا کے ذریعے جب کبھی مٹی اٹھتی ہے تو کپڑے خراب کرتی ہے اور لوگ جھاڑ کر نیچے پھینکتے ہیں پہاڑ اگرچہ بڑے بڑے اونچے ہوتے ہیں مگر اپنی چوٹی کے درختوں سے پھر بھی نیچے ہوتے ہیں اور نیچے رہتے ہیں ہم بھی جب خدا کے برابر نہیں ہو سکتے تو خدا کے سامنے جھکے رہیں۔ عارف رومیؒ لکھتے ہیں:

ایک اونٹ جنگل میں چلا جا رہا تھا اس کی مہار زمین پر گھستی چلی جا رہی تھی ایک چوہے نے اسے دیکھا تو دل میں کہا کہ اس کو یوں کھلا چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے اس کی مہار تھام لینا چاہیے تا کہ یہ شتر بے مہار نہ کہلائے۔ پس اس نے دوڑ کر اس کی مہار کو منہ میں لے لیا اور آگے آگے روانہ ہو پڑا اونٹ نے بھی اس سے مذاق کیا اور پیچھے پیچھے بے تکلف ہولیا آگے پانی آیا اور چوہا رک گیا اونٹ نے پوچھا اے میرے رہبر تو اس قدر ڈر کیوں گیا؟ چوہے نے شرمندگی سے کہا بھائی یہ پانی دیکھ کر میرا دل دہل گیا ہے اونٹ نے کہا تو نہ ڈر میں ابھی دیکھ کر بتاتا ہوں کہ پانی کتنا گہرا ہے اونٹ دریا میں چلا گیا اور کہا تم بھی آجا پانی تھوڑا ہے میرے زانو تک نہیں ڈوبے تو کیسے ڈوب سکتا ہے؟ چوہے نے کہا بھائی تو مجھے غرق کرنا چاہتے ہو جو پانی تیرے زانو تک گہرا ہے وہ میرے سر سے کئی گز اونچا پہنچے گا۔

اس پر اونٹ نے کہا پھر تو میرا پیشوا کیسے بن سکتا ہے؟ آئندہ ہم سری کا دعویٰ اپنے جیسے چوہوں سے کرنا کسی اونٹ کے منہ نہ لگنا، چوہے نے کہا میری توبہ۔ آئندہ ایسی جرأت نہیں کروں گا اب خدا کے لیے مجھے پار اتار دے۔ اونٹ کو رحم آیا بولا کہ آ میری پیٹھ پر بیٹھ جا تیرے جیسے لاکھوں چوہوں کو پار اتار سکتا ہوں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب تم بادشاہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو رعیت بن کر گزارہ کرو اور خدمت گزاری سے عزت حاصل کرو۔

یامکن بافیل بانان دوستی
یابناکن خانہ بر انداز فیل

غرض نماز کی روح حاصل کرنی ضروری ہے۔

روزہ کی روح اپنے اندر قوت برداشت کا حصول ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ناگزیر ضروریات زندگی کے معاملہ میں (جیسے کھانے پینے وغیرہ) برداشت کا طریقہ اختیار کر کے آدمی اپنے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ سماج کے اندر تحمل اور برداشت کے ساتھ رہے۔ جذبات اُبھارنے والے واقعہ پر وہ بے قابو ہونے سے بچے۔ زکوٰۃ کی روح خیر خواہی ہے زکوٰۃ میں آدمی اپنی کمائی کا ایک

حصہ دوسروں کو دے کر اپنے اندر یہ جذبہ ایجاد کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھے۔ دوسروں کی ضرورت کے وقت وہ ان کے کام آئے۔ حج کی روح اتحاد ہے حج کے موقع پر ساری دنیا کے مسلمان ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں ایک ہی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں ایک ہی عمل میں سب سرگرم ہوتے ہیں یہ اتحاد و اتفاق کا سبق ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں وہ مل جل کر رہیں اختلافات میں الجھنے کے بجائے وہ متحد اور متفق ہو کر زندگی گزاریں۔

انسان کا جسم باقی رہے مگر اس کی روح نکل جائے تو ایسا انسان مردہ انسان ہے اسی طرح جس عبادت کی شکل موجود ہو مگر اس کی روح نکل جائے تو ایسی عبادت مردہ عبادت ہے اس سے وہ فائدہ نہیں مل سکتا جو زندہ عبادت سے عبادت کرنے والے کو ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں روح والی عبادات کی توفیق نصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ اسلامی عقائد اخلاق، اعمال، معاشرت اور معاملات کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اِنَّ فِی الدُّنْیَا جَنَّۃً مَنْ لَّمْ یَذُقْھَا لَمْ یَدْخُلْ جَنَّۃَ الْاٰخِرَۃَ

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ دنیا میں بھی ایک جنت ہے جو شخص دنیا کی جنت کا ذائقہ نہیں چکھے گا وہ آخرت کی جنت میں نہیں جا سکتا۔ اِنَّ فِی الدُّنْیَا جَنَّۃً مَنْ لَّمْ یَذُقْھَا لَمْ یَدْخُلْ جَنَّۃَ الْاٰخِرَۃَ ۔ دنیا کی جنت یہ ہے کہ وہ اعمال جو آدمی کو آخرت کی جنت میں لے جانے والے ہیں وہ اس کے لیے محبوب بن جائیں۔ جنت میں داخلہ جس طرح آدمی کے لیے انتہائی پسندیدہ ہوگا اسی طرح جنت والے اعمال میں اس کو لذت اور اطمینان حاصل ہونے لگے۔

دنیا کی جنت یہ ہے کہ باب پر یقین کرنے سے زیادہ یقین مسبب الاسباب پر ہو...... دنیا کی محبت سے زیادہ خدا کی محبت اس کو عزیز ہو...... اور دنیا کے خوف سے زیادہ خدا کا خوف اس کے

لیے اہمیت رکھتا ہو...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کو قبول کرنا اس کو ہر حال میں پسندیدہ ہو...... خواہ وہ اس کے خلاف کیوں نہ جاتا ہو۔ وہ دنیاوی مصلحتوں کے بجائے آخرت کی مصلحتوں کو اہمیت دے...... حق کو نظر انداز کرنے کے مقابلہ میں حق کو مان لینا اس کی نظر میں زیادہ محبوب بن جائے...... قہقہہ لگانے سے زیادہ تسکین اس کے دل کو اس وقت ملتی ہو جب کہ وہ اللہ کے لیے آنسو بہا رہا ہو...... انتقام سے زیادہ تسکین اس کو معافی دینے میں ملتی ہو...... غصب کرنے سے زیادہ راحت حقوق ادا کرنے میں محسوس کرے...... ایسے آدمی کے لیے دنیا بھی جنت بن جاتی ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو جب بادشاہ وقت نے بار بار جیل بھیجا تو آخر میں امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جیل سے بادشاہ کے نام ایک خط روانہ کیا اور اس میں لکھا ﴿إِنَّ جَنَّتِيْ مَعِي سَارت حَيْثُ سرت یعنی میری جنت میرے ساتھ رہتی ہے جہاں میں جاتا ہوں وہاں میری جنت بھی جاتی ہے۔﴾ اور جب حضرت کا جنازہ ہو رہا تھا تو 22 ہزار آدمی چھتوں سے درختوں سے گر کر ہلاک ہو گئے۔ لاکھوں نے جنازہ میں شرکت کی اور آسمان سے آواز آئی ﴿هٰكَذَا جَنَائِزَ اَئِمَّةَ السُّنَّةَ کہ سنت پر چلنے والوں کے جنازے اس طرح ہوا

کرتے ہیں۔ ﴾ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ رحمةً وَّاسِعَةً

دنیا میں جنت یہ ہے کہ اپنے آقا و مالک کو نہ بھولے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہرات کا گورنر عماد الملک سخاوت میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا اس کی رعایا اس سے بڑی خوش تھی اس کے پانچ سو غلام تھے اور گورنر ان کو اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ غلاموں کی گردنوں میں سونے کی زنجیریاں ان کے کمر بند بھی سونے کے ہوتے تھے اطلس و کمخواب میں ملبوس رہتے تھے۔ ایک دن یہ غلام اپنی شان وشوکت کے ساتھ بازار میں جا رہے تھے کہ ایک آدمی ننگ دھڑنگ جس نے صرف ایک لنگوٹی ڈالی ہوئی تھی آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور شکوہ کرتے ہوئے کہا! اے اللہ میرے جسم پر تو کپڑا نہیں، کھانے کو ملتا نہیں، تو میرا پروردگار ہے ذرا عماد الملک سے بندہ پروری سیکھ۔

اس بات پر ایک مدت گزر گئی۔ اتفاق سے گورنر کا زوال شروع ہوا بادشاہ نے کسی بات سے ناراض ہو کر گورنر کو جیل میں ڈال دیا اور اس کے غلاموں کو بھی قیدی بنا لیا اور غلاموں سے بادشاہ نے تحقیق شروع کر دی کہ گورنر کے چھپے خزانے کہاں پڑے ہوئے ہیں مگر کسی نے بھی بادشاہ کو اس بھید سے آگاہی نہ دی۔ بادشاہ نے

ان غلاموں کو بے انتہا اذیت ناک سزائیں دیں لیکن پھر بھی ان پانچ سو میں سے ایک بھی اپنے آقا سے بے وفائی کرنے پر رضا مند نہ ہوا۔ حالاں کہ گورنر کے خزانے کا راز سب کو معلوم تھا ان سب نے اذیت ناک سزائیں برداشت کرلیں مگر اپنے آقا کا بھید بادشاہ کے سامنے ظاہر نہ کیا۔

اس بے باک آدمی نے غلاموں کے ساتھ کیا جانے والا یہ سلوک دیکھا تو اسے غیب سے آواز آئی کہ دیکھ تو بھی ان غلاموں سے بندہ بننا سیکھ کہ بے انتہاء تکالیف برداشت کر کے بھی ثابت قدم رہے اور اپنے آقا کو نہیں بھولے اور ایک تم ہو کہ معمولی سی تکلیف آجانے پر اللہ تعالیٰ سے شکوہ شکایت شروع کر دیتے ہو۔ اور اس قدر بے باکی سے بات کہہ دیتے ہو کہ اے اللہ! عماد الملک سے بندہ پروری سیکھ۔ لیکن اے انسان پہلے تو عماد الملک کے غلاموں سے بندہ بننا سیکھ۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ تقاضائے فطرت کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا

خدا تعالیٰ نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں ان کی کارکردگی کا اس نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے ہر چیز ٹھیک اسی پیمانہ کے مطابق اپنا عمل کرتی ہے اور منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوتی ہے ﴿ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (پ ۱۸، الفرقان) ''اور اس نے ہر چیز پیدا کر کے ٹھیک اندازہ پر رکھی۔'' ﴾ سورج چاند اور ستاروں کی گردش کے نہایت محکم ضابطے ہیں اور ایک لمحہ کے فرق کے بغیر وہ ٹھیک اسی کے مطابق اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ﴿ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (پ ۱۳، الرعد ۸) ''اور ہر چیز کا اس کے یہاں اندازہ ہے۔'' ﴾

جب ہر چیز کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ اللہ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چلے تو انسان کی کامیابی کے بھی یہی اصول ہیں

کہ وہ اللہ کے قوانین کے مطابق چلے اور کامیابی حاصل کرے اور وہ قانون یہ ہیں کہ اہل باطل کے مقابلے میں اہل حق مضبوط بنیادوں پر اپنی تعمیر کریں وہ اپنے وقت...... اپنے مال ...... اور اپنے طاقت کردار سے خدا تعالیٰ کے دین کی عمارت اتنی مستحکم کر دیں کہ خدا کے دشمن اس کو ہلا نہ سکیں۔ خدا تعالیٰ اپنے دین کو زمین پر غالب و سر بلند دیکھنا چاہتا ہے اور یہ کام اہل ایمان کی جدو جہد اور قربانیوں ہی کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ایک مثال مکڑی کے گھر کی دی گئی ہے ﴿وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ (پ۲۰، العنکبوت، ۴۱) ''اور سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔''﴾ دوسری مثال لوہے کی ہے ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ (پ۲۷، الحدید، ۲۵) ''اور ہم نے اتارا لوہا اس میں انتہائی سختی ہے۔''﴾

بیت العنکبوت معمولی جھٹکے کو بھی سہار نہیں سکتا مگر بیت الحدید کے مقابلے میں بڑے بڑے طوفان بھی بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح خدا تعالیٰ نے دو عملی مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ تم اپنے دین کا گھر مکڑی کے گھر کی طرح نہ بناؤ بلکہ لوہے کے گھر کی طرح بناؤ۔ مضبوط اور یقین تعمیر کے لیے خدا تعالیٰ کا جو طریقہ ہے اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ خاموش تدبیر کے ذریعہ دشمن کو بے زور کر دیا

جائے اور اس کی جگہ حق کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا جائے۔
﴿قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (پ۱۴،النحل،۲۶) ''ان سے پہلے لوگوں نے بھی مکاریاں کی تھیں تو خدا ان کی عمارت کے ستونوں پر آ پہنچا اور چھت ان پر ان کے اوپر گر پڑی اور ان پر عذاب آ واقع ہوا جہاں سے ان کو خیال بھی نہ تھا۔''﴾
﴿هُوَ الَّذِيْ أَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ أَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِنَ اللّٰهِ فَأَتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِأَيْدِيْهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ (پ۲۸،الحشر،۲) ''وہی ہے جس نے نکال دیا ان کو جو منکر ہیں کتاب والوں میں ان کے گھروں سے پہلے ہی حشر میں تمہیں گمان نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے قلعے انہیں اللہ سے بچا لیں گے تو اللہ کا حکم ان کے پاس آیا جہاں سے گمان بھی نہ تھا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈالا اُجاڑنے لگے اپنے گھر اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو۔''﴾

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ دشمن کے جڑوں کا کھوکھلا کر دیا جائے یہ عمل اپنی

تکمیل تک اس طرح جاری رہے کہ دشمن کو خبر نہ ہو اور اچانک ایک روز اس کی پوری چھت اس کے سامنے گر پڑے مثال کے طور پر دیمک کو دیکھئے:

''دیمک انسان کا ایک دشمن کیڑا ہے دیمک چیونٹی کی طرح چھوٹا ہونے کے علاوہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ کھلی ہوا یا دھوپ میں زندہ نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ وہ مٹی کی نالی بنا کر چلتا ہے۔ اس کمزوری کے باوجود دیمک ہمیشہ انسان کو نقصان پہنچانے میں کامیاب رہتی ہے۔''

اس کا راز یہ ہے کہ دیمک اتنی خاموشی کے ساتھ اپنا عمل کرتا ہے کہ انسان کو صرف اسی وقت اس کی خبر ہوتی ہے جب کہ وہ اپنا کام کر چکا ہو آپ کے کمرے کا دروازہ اگر لکڑی کا ہے تو اس کے بازوؤں میں نہایت خاموشی کے ساتھ دیمک داخل ہو جائے گی وہ اندر ہی اندر لکڑی کو کھانا شروع کرے گی بازوؤں کے اوپر آپ نے جو خوبصورت پالش کرا رکھی ہے اس کو کاغذ کی طرح چھوڑ دے گی۔ مزید یہ کہ وہ لکڑی کا جتنا حصہ کھائے گی اتنا ہی اس کے اندر مٹی بھرتی چلی جائے گی اس طرح دیمک پوری لکڑی کھا ڈالے گی اور آپ کو اس کی خبر نہ ہو سکے گی۔

دوسری طرف اسی دنیا میں ایک اور مثال ہے یہ کتے کی مثال ہے۔ کتا بھی انسان کو کاٹنا چاہتا ہے مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو کاٹ پائے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتا آدمی کو دیکھ کر دور ہی سے بھونکنا شروع کر دیتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی چوکنا ہو کر اپنا بچاؤ کا انتظام کر لیتا ہے۔ پس کامیاب ہونے کے دو اصول ہیں ایک یہ ہے کہ ہم خدائی نظام کے موافق چلیں تب کامیابی ہوگی فرائض ادا کریں گناہوں سے توبہ کریں اجتماعی اور انفرادی طور پر دوسرا یہ ہے کہ ہم زیر زمین کام کریں خفیہ کام کریں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن

......☆......☆......☆......☆......

وقار کے ساتھ کام کرنے کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (پ۱۷، الانبیاء) آدمی جلد باز بنایا گیا۔

وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بے صبرا اور جلد باز واقع ہوا ہے۔ (بنی اسرائیل ۱۱) بلکہ جلد بازی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ (انبیاء ۳۷)

صحیح طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ اولوالعزمی کے ساتھ صبر و انتظار کا طریقہ اختیار کیا جائے جلد نتیجہ دیکھنے کی خواہش نہ کی جائے۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (پ۲۶، محمد) ''اے ایمان والو! اگر تم دین خدا کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔''﴾ جلد بازی یہ ہے کہ کسی مقصد کو پانے کے لیے جو ابتدائی شرائط ضروری ہیں ان کی تکمیل کے بغیر قبل از وقت اس مقصد کو پانے کی کوشش کرنا، مثلاً

چنار کا درخت بن کر اس کے لیے کھڑا ہو جائے انسان کو یہ اختیار ضرور ملا ہوا کہ وہ جلد بازی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے وقت اور قوت کو ضائع کرتا رہے مگر خدا تعالیٰ کے یہاں کسی واقعہ کا ظہور کے لیے جو فطری مدت مقرر ہے اس کو بدلنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ یہ ضابطہ اتنا محکم ہے کہ اس میں پیغمبر تک کا کوئی استثناء نہیں۔ کسی مقصد کے ظہور کے لیے وقت کی جو حد ہے اس کی خلاف ورزی لازمی طور پر نقصان کا سبب بنے گی۔ اس سلسلے میں واضح مثالیں موجود ہیں:

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ جب صحراء سینا میں پہنچے تو خدا تعالیٰ نے ان کے لیے ایک ماہ کی مدت مقرر کی اور فرمایا تم کوہ طور پر آ کر ۳۰ دن ذکر وعبادت میں گزارو اس کے بعد ذی الحجہ کی دس تاریخ کو تمہیں شریعت دی جائے گی۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ۱۰ ذی قعدہ کو طور پر پہنچنا چاہیے تھا مگر وہ دس دن پہلے یکم ذی قعدہ کو طور پر پہنچ گئے۔ اللہ نے پوچھا اے موسیٰ تم اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی کیوں چلے آئے۔ ﴿وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى (پ۱۶، طٰہٰ) ''اور تو نے اپنی قوم سے کیوں جلدی کی اے موسیٰ۔'' ﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ لوگ میرے پیچھے ہیں اور میں جلدی

اس لیے آ گیا تا کہ تو مجھ سے راضی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (پ۱۶، طٰہٰ، ۸۳۔۸۵)'' فرمایا تو ہم نے تیرے آنے کے بعد تیری قوم کو بلا میں ڈالا اور انہیں سامری نے گمراہ کر دیا۔'' ﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جلد خدا سے ملنے کا شوق ہوا وہ بنی اسرائیل کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے سپرد کر کے وقت سے دس دن پہلے پہاڑ پر چلے گئے۔ چناں چہ قوم کے مفسدین نے غلبہ پا لیا اور قوم کو بچھڑے کی پرستش میں مبتلا کر دیا۔ یہ عجلت اگر چہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی اور خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے تھی مگر نہ تو اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا کہ وہ مقررہ تاریخ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کی تختیاں حوالے کر دے اور نہ ایسا ہوا کہ اخلاص اور نیک نیتی کی بناء پر وہ نتیجہ نکلے جو ازروئے حقیقت نکلنا مقدر تھا۔

دوسری مثال شراب کی حرمت کی ہے:

رسول اللہ ﷺ انسان کے لیے اصلاح و فلاح کا جو نظام لے کر آئے تھے اس میں شراب کی حرمت بھی مطلوب کے درجہ میں شامل تھی مگر آپ ﷺ نے اپنی نبوت کے تقریباً نصف عرصہ تک اس

معاملہ کا کوئی ذکر نہیں چھیڑا عملاً لوگوں کو ان کے حال پر رہنے دیا اور بتدریج شراب کی مذمت بیان فرماتے رہے۔ پہلا حکم شراب کا آیا تو اس میں صرف ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تا کہ ذہنوں کو اس کی حرمت قبول کرنے کے لیے تیار کیا جائے اور فرمایا کہ ان چیزوں میں بڑی خرابی ہے اور ان میں لوگوں کے لیے کچھ فائدہ بھی ہے۔ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (پ۲، البقرۃ) ''تم سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں تم فرما دو ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ دنیوی نفع بھی اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔''﴾

اس کے بعد ۴ ہجری میں شراب کے متعلق دوسرا حکم آیا مگر اب بھی اس کی مکمل ممانعت نہیں کی گئی۔ ایک ایسی بات کہی گئی جس سے شراب کا ناپاک ہونا واضح ہوتا تھا اور حکم یہ تھا کہ تم نماز کے قریب نہ جاؤ جب کہ تم نشے میں ہو۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (پ۵، النساء) ''اے ایمان والو! نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ جب تک اتنا ہوش نہ ہو کہ جو کہو اُسے سمجھو۔''﴾ مذکورہ حکم کے کچھ عرصہ بعد شراب کی مکمل حرمت نازل ہوئی۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ

وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاک ہی ہیں شیطانی کام تو ان سے بچتے رہنا کہ تم فلاح پاؤ۔" (پ ۷، المائدہ) ﴾ شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ وہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے۔ اب لوگوں کے ذہن تیار ہو چکے تھے۔ چناں چہ یہ آیت آتے ہی لوگ کہہ اٹھے۔ انتهينا ربنا انتهينا ربنا اے ہمارے رب ہم باز آئے اے ہمارے رب ہم باز آئے۔ اور شراب کے ذخیروں کو زمین پر بہا دیا۔

شراب کی حرمت کے متعلق جو حکمت تدریج اختیار کی گئی اس کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

> "قرآن میں سب سے پہلے مفصل سورتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا تذکرہ ہے یہاں تک کہ جب لوگوں کے دِل اسلام کے لیے ہموار ہو گئے تو حرام حلال آیتیں اتریں۔ اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر پہلے ہی اترتا کہ زنا

نہ کروتو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔"

اسی طرح آپ ﷺ نے بتوں کو فوراً تڑوانے کی بجائے آٹھ ہجری کا انتظار فرمایا اور اہل شرک جو ننگا ہو کر طواف کرتے تھے آپ نے فتح مکہ کے وقت انہیں منع فرمایا نہ خود حج کیا بلکہ ۹ ہجری میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر اعلان کروایا کہ آج کے بعد کوئی ننگا طواف نہ کریں، تب ۱۰ ہجری کو آپ ﷺ حج پر تشریف لے گئے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ صحیح فکر کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

فکر کی دو قسمیں ہیں ایک غلط فکر اور دوسری صحیح سوچ۔ غلط فکر اسباب پر اعتماد کا نام ہے کہ محنت کروں گا مال حاصل ہوگا، کامیابی ملے گی ...... کاروبار ہوگا اعتماد حاصل کروں گا ...... سلطنت ہوگی تو عزت ملے گی ...... وزارت ہوگی تو طاقت ملے گی ...... زراعت تجارت چلے گی تو راحت ہوگی ...... بازو کی طاقت ہوگی تو کامیاب بنوں گا، یہ ہے غلط سوچ۔ کیوں کہ ان چیزوں میں کامیابی نہیں قومِ ثمود کے پاس کاروبار بھی تھا۔ طاقت بھی تھی مگر پھر بھی ناکام رہے ان میں سے جو پہاڑوں کو کرید کرید کر تہہ خانوں میں رہتے تھے ان کو جبرائیل علیہ السلام کی چیخ نے مارا ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ﴾ اور جو شہروں میں رہتے تھے ان کو زلزلہ نے مارا ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (پ۸، الاعراف، ۷۸)﴾ اور جو جنگلوں میں رہتے تھے ان پر آگ برسائی گئی ﴿فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ (پ۱۹، الشعرآء، ۱۸۹)﴾

قومِ عاد جو طاقت کے بھی مالک تھے ساٹھ ساٹھ گز ان کا قد ہوا کرتا تھا باغات کے بھی مالک تھے مگر اس کے باوجود ناکام رہے۔ ﴿رِیْحًا صَرْصَرًا (پ۲۷، القمر،۱۹)﴾ ریح صرصر سے ان کی ہلاکت ہوئی قوم شعیب کاروباری تھی مگر ناپ تول میں کمی کرتی تھی لینے کا پیمانہ الگ دینے کے الگ۔ حضرت شعیب نے فرمایا بھی تھا ﴿اَوْفُوا الْكَیْلَ "پورا بھر کردو ماپ۔" (پ۱۹، الشعرا،۱۸۱)﴾ مگر وہ نہ مانیں زلزلہ سے ان کو تباہ کردیا گیا۔

گناہ ہلاکت کا سبب ہے۔ حدیث پاک میں ہے جب میری امت سرکاری خزانہ کو عیاشی میں خرچ کریں گے، امانت کو غنیمت سمجھیں گے، زکوٰۃ کو تاوان سمجھیں گے، قرآن وسنت کو چھوڑ کر دنیاوی معاشی علوم پڑھیں گے، بیوی کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کریں گے، دوست کو قریب باپ کو دُور کریں گے، قبیلہ کا سردار فاسق ہوگا، ملک کا بادشاہ ذلیل ہوگا، آدمی کی اطاعت اس لیے ہوگی تاکہ اس سے شر سے محفوظ ہو، گانے عام ہوجائیں گے، مسجد میں دنیاوی باتیں ہوں گی، شراب عام ہوجائے گی، ریشم پہنیں گے۔ اس وقت ہوا سے خسف سے مسخ سے بستی کی بستی اجڑ جائے گی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں نیچے سے جب آسمان کی طرف نیکیاں جاتی تھیں تو اوپر سے رحمتیں اترتی تھی اور آج نیچے سے گناہ جاتے ہیں تو اوپر سے عذاب اترتا ہے۔ ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ "اور جو پڑے تم پر سختی سو وہ بدلا ہے اُس کا جو کمایا تمہارے ہاتھوں نے" (پ ۲۵، الشوری، ۳۰)﴾ مخلوق کی تباہی اللہ کے لیے مشکل نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اگر یہ بڑے آسمان، پہاڑ، زمین تیرے حکم عدولی کریں تو ان کے کنٹرول کا کیا انتظام ہوگا؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ میرے پاس ایسے جانور ہیں کہ سات آسمان ان کا ایک لقمہ بنتا ہے میں ایک ہی جانور کو حکم کروں تو ان آسمانوں اور پہاڑوں کو زمین سمیت نگل جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا وہ جانور کہاں ہوتے ہیں؟ فرمایا: ﴿فی مرج من مروجی ﴾ پوچھا وہ چراگاہ کہاں ہیں؟ فرمایا: ﴿فی علم من علومی "وہ میرے علم میں ہیں"﴾ ﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا "اور نہیں تم کو علم دیا گیا مگر تھوڑا"﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب ایک مردہ کو باذن اللہ زندہ کیا اور پوچھا کہ بیت المقدس کے لوگ کیوں تباہ ہوگئے تو اس نے کہا

﴿حسب الدنیا اور مجالس الفساق فتبینا بالامنة واصبحنا بالهاویه﴾

طوفان نوح سے تین آدمی پہاڑ کی چوٹی میں کنوں کے اندر چھپے مگر تینوں کو پیشاب آیا اور پھر پیشاب بند نہیں ہوا یہاں تک کہ کنواں ان کے پیشاب سے بھرا اور وہ اپنے پیشاب میں ڈوبے۔ گناہوں کو چھوڑنا انتہائی ضروری ہے اور ہم گناہ کیوں نہیں چھوڑتے حالاں کہ یہ گناہ ہمارے ایمان کے منافی ہیں۔

ایمان بھی ہو...... اور غیر عورتوں کو بھی دیکھیں۔ ایمان بھی ہو...... اور یہودی کاروبار بھی کریں۔ ایمان بھی ہو...... اور گانے بھی سنیں۔ دودھ والے برتن میں تو پیشاب نہیں کرتے ...... مگر ایمانی اعضاء میں گناہ بھرتے ہیں جو پیشاب سے بھی نجس ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿سیرت کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا
وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

جو چیزیں انبیاء کرام علیہم السلام خدا تعالیٰ سے مانگا کرتے تھے وہ چیزیں اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو از خود پیش فرمائی ہیں۔

مثلاً ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے اپنا حسنِ ذکر مانگا تھا کہ دنیا والے مجھے اچھے الفاظ میں یاد کرتے رہیں۔ ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ " اور رکھ میرا بول سچا پچھلوں میں۔" (پ۱۹، الشعراء، ۸۴)﴾

مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ " اور ہم نے تمہارے لئے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔" (پ۳۰، الم نشرح)﴾ کہ آپ کا نام اپنے نام کے ساتھ بلند اور مشہور کروں گا آج ہم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھتے ہیں۔ اذان میں، تکبیر میں، شہادۃ توحید کے ساتھ شہادۃ رسالت بھی ادا کرتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے شرح صدر کی دعا مانگی تھی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے خود فرمایا ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ "کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہ کیا۔" (پ۳۰، الم نشرح)﴾ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ہے ﴿وَلَاتَتَّبِعِ الْهَوٰى "اور نہ چل جی کی خواہش پر۔" (پ۲۳، ص، ۲۶)﴾ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى "اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔" (پ۲۷، النجم، ۳)﴾ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں قرآن پاک کا ارشاد ہے ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ فَنَسِيَ "اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا۔" (پ ۱۶، طٰہٰ، ۱۱۵)﴾ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى "اب ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم نہ بھولو گے۔" (پ۳۰، اعلیٰ)﴾

ساری انسانیت کو حکم ہے کہ اللہ کو راضی کرو مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے راضی فرمایا ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى "اور بیشک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔" (پ۳۰، الضحیٰ)﴾ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک راضی کرتے

ہیں تو کیا ہمارا فرض نہیں بنتا کہ ہم آپ ﷺ کو راضی رکھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک رات گشت فرما رہے تھے ایک بوڑھی بیوہ خاتون چرخہ چلا رہی تھی اور آپ ﷺ پر درود و سلام پڑھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ مرنے کے بعد میرا جنت میں جانا یقینی نہیں اور اگر بالفرض جنت مل بھی گئی تو آپ کی جنت میں تو پہنچ نہیں سکتی تو میں اس جنت سے کیا کروں جس میں آپ کا دیدار نہ ہو۔ حضرت عمرؓ بہت روئے اور ان سے دعا کی درخواست کی۔

حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا عمرو بن جموح کی بیوی ہے اس کو بتایا کہ اُحد کی لڑائی میں تیرا خاوند فوت ہوا فرمانے لگیں خدا کے سپرد، پھر بتایا گیا تیرا بھائی بھی شہید ہو گیا فرمانے لگیں اللہ تعالیٰ کے سپرد، پھر بتایا گیا تیرے دو بیٹے بھی شہید ہو گئے فرمانے لگیں اللہ کے سپرد، اور آپ ﷺ کو دیکھا تو کہنے لگیں ﴿ کل مصیبة بدعك جلل جب آپ زندہ ہیں تو ساری مصیبتیں ہیچ ہیں۔ ﴾

غرض جو آپ ﷺ سے کٹا ذلیل ہوا۔ ابولہب کو دیکھو ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ "ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ آپ۔" (پ۳۰، اللہب ،۱) ﴾ جو آپ ﷺ سے جڑا زندہ ہوا۔ بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھو آپ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن

ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے دائیں ہوں گے عمر رضی اللہ عنہ بائیں ہوں گے بلال رضی اللہ عنہ کا حشر میرے پاؤں میں ہوگا حالاں کہ بلال رضی اللہ عنہ کی تدفین شام میں ہو چکی ہے اور فرمایا میں براق پر اور بلال سرخ اونٹنی پر اذان دیتے ہوں گے۔

جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹا تو ابو جہل بنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑا تو ﴿سلمان مِنّا مِنْ اَهْلِ الْبُيْتِ﴾ بنا۔ خندق کا ایک حصہ جب مہاجرین کے سپرد ہوا اور دوسرا انصار کے تو مہاجر کہنے لگے سلمان منا اور انصار نے کہا سلمان منا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿سَلمَان مِنّا مِنْ اَهْلِ الْبُيْت﴾ لہٰذا سلمان رضی اللہ عنہ میرے ساتھ خندق کی کھدائی میں مشغول ہوگا۔ خالد ولید کافر کا لڑکا ہے مگر جنگِ موتہ میں جب حضرت زید رضی اللہ عنہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ، جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ یکے بعد دیگر شہید ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿سل اللّٰه سَيْفًا مِنْ سُيُوْفِه﴾ اور وہ تھے خالد رضی اللہ عنہ۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿مقصد زندگی کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا
وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

اللہ پاک نے ہمیں زندگی عطا کر کے ہم پر عظیم انعام فرمایا مگر اس زندگی کا مقصد بھی اللہ نے مقرر فرمایا ہے اور ہم اس مقصد سے ناواقف ہیں بلکہ ہم میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی کا الگ الگ مقصد بنایا ہے...... کسی نے تجارت کو...... کسی نے زراعت کو...... کسی نے صنعت اور ملازمت کو...... اور جو ان مقاصد میں کامیاب نظر آتا ہے...... ہم اس کو کامیاب سمجھتے ہیں اور جو ان میں ناکام ہوتا ہے...... ہم اس کو ناکام سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ نہ تو انسان اپنی زندگی کا مقصد متعین کر سکتا ہے اور نہ اپنی زندگی کے لیے قانون بنانے کا مجاز ہے۔

کیوں کہ انسان کے اندر چار نقائص ہیں:

۱) انسان ظالم ہے اپنا حق چھوڑتا نہیں، اور دوسروں کا حق دیتا نہیں۔

۲) انسان انجام سے جاہل ہے اور ناواقف ہے ﴿اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا "یہ ہے بڑا بے ترس نادان" (پ۲۲، الاحزاب، ۷۲)﴾

۳) انسان جلد باز ہے۔ ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ "بنا ہے آدمی جلد باز" (پ ۱۷، الانبیاء، ۳۷)﴾

۴) انسان ضعیف ہے جب بیمار ہو ڈاکٹر کا محتاج ہے، جب دیوار ٹیڑھی ہو انجینئر کا محتاج ہے، جب مقدمہ ہو تو وکیل کا محتاج ہے۔

جب انسان اتنے چھوٹے کاموں میں دوسروں کا محتاج ہے تو مقصد زندگی تو اعلیٰ مقام ہے اس کو انسان کب متعین کر سکتا ہے اور اس زندگی کے لیے قانون کب بنا سکتا ہے۔ زندگی کے لیے قانون بنانا صرف خالقِ کائنات کا حق ہے۔ کیوں کہ قانون ساز کے لیے علمِ محیط شرط ہے شفقتِ کامل شرط ہے اور قدرتِ نافذہ شرط ہے اور یہ تینوں شرطیں اللہ کے سوا کسی میں نہیں۔

اللہ پاک کا علم اتنا وسیع ہے کہ صحرا کا کوئی ذرہ اس سے مخفی نہیں...... نہ ہوا کا ایک جھونکا ......نہ بارش کا کوئی قطرہ ...... ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ "بیشک اللہ سے چھپی نہیں کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں" (پ۳، آل عمرآن، ۵)﴾ اس کی شفقت اتنی کامل ہے کہ دنیا بھر کی ماؤں کی

محبت اس کی محبت کے سامنے اتنی بھی نہیں جتنا قطرہ سمندر کے سامنے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جب زمین کو حکم دیا کہ قارون کو پکڑ لو اور پہلی بار زمین نے قارون کو گھٹنوں تک کھینچا تو قارون نے معافی مانگنی شروع کی مگر موسیٰ علیہ السلام نے معاف نہیں فرمایا بلکہ دوبارہ زمین کو حکم دیا اور ناف تک زمین میں دھنسا پھر معافی مانگی مگر موسیٰ علیہ السلام نے پھر زمین کو حکم فرمایا تو گلے تک زمین میں چلا گیا اور بالآخر دھنس ہی گیا اور جب دھنسا تو اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا قارون نے آپ سے تین بار معافی مانگی اور آپ نے معافی نہیں دی اگر مجھے ایک بار بھی پکارتا میں اس کو چھوڑ دیتا، یہ ہے شفقت۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام بغیر مہمان کے کھانا نہیں تناول فرماتے ایک دن جب مہمان نہیں آیا تو حضرت راستے میں کھڑے ہوگئے تاکہ مہمان ملے اور میرے ساتھ کھانا کھائے، اتنے میں (۸۰) اَسّی سالہ کافر گزرتے دیکھ لیا ہاتھ پکڑ کر دستر خوان پر بٹھایا اور جب اس کو کلمہ پڑھنے کے لیے کہا اس نے انکار کیا تو فوراً اس کو دستر خوان سے اٹھا دیا۔ مہمان کے جانے کے بعد اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا میں اس بوڑھے کافر کو اَسّی سال سے کھلاتا ہوں مگر آپ ایک وقت بھی نہیں کھلا پائے۔

قانون ساز کے لیئے تیسری شرط ہے قدرتِ کاملہ اور یہ اللہ کے سوا کسی میں نہیں۔ اللہ نے ایسے جانور پیدا فرمائے جن کا ایک لقمہ آسمان کے برابر ہے وہ جانور جن چراگاہوں میں ہوں گے وہ چراگاہیں کتنی بڑی ہوں گی۔

یہ قدرتِ کاملہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں میں سے جو بیت المقدس شہر میں عذاب الٰہی سے ہلاک ہو چکے تھے ایک آدمی کو زندہ کیا اور ان سے پوچھا کیسے تم لوگ ہلاک ہو گئے؟ تو اس نے جواب دیا ﴿بتنا بالامنة واصبحنا بالهاوية﴾ ہم پرامن گھروں میں سوئے مگر صبح کو اپنے آپ کو جہنم میں پایا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿ دین اپنانے اور پھیلانے کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ

''تم بہترین امت ہو لوگوں کی نفع رسانی کیلئے پیدا کیے گئے ہو، نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور ایک اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

کسی شکاری نے ایک پرندہ پکڑ کر پنجرہ میں عرصہ دراز بند رکھا یہاں تک کہ اس کے پاؤں اور پَر دونوں شَل ہو گئے اس کے بعد اس شخص نے پنجرے سے تو نکال دیا مگر اس میں نہ چلنے کی طاقت تھی اور نہ اُڑنے کی۔

چھوڑ دیا صیاد نے بھی تو کیا ہوا
تابِ پرواز نہیں راہِ چمن یاد نہیں

یہ مثال اس شخص کی ہے کہ انسان اسلامی باغ کا پرندہ تھا شیطان نے پکڑ کر خواہشات کے پنجرے میں بند کر دیا یہاں تک کہ

انسان میں نہ تو پرواز کی طاقت رہی اور نہ اپنے چمن کا راستہ معلوم رہا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ دنیاوی دھندوں سے آزاد تھے اس لیے انہوں نے اسلام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔ اُندلس اور سپین کی مساجد سے پوچھو یہ مساجد کیسے بنیں اور کس نے بنائیں؟

مؤرخین لکھتے ہیں کہ سپین کی مسجد کے ایک ایک ستون کے پاس لاکھوں قرآن پاک پڑھے جا چکے ہیں ہر ایک پتھر پر کروڑوں سجدے ہو چکے ہیں مگر آج اس مسجد میں انگریز گھوڑے باندھ رہے ہیں۔ لعنت الله علیٰ آبائهم۔ سپین کی مسجد انتظار میں ہے کہ اس اُمت کا قافلہ تو یہاں آیا تھا مگر اس قافلے کے آخری لوگ ابھی تک نہیں پہنچے، ہم کیسے پہنچیں؟ ہم تو دنیا کے پنجرے میں قید ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دنیا کی قید و بند سے آزاد تھے۔ کیوں کہ انہوں نے دین کی خاطر دنیا کو چھوڑا تھا اور اللہ تعالیٰ کے دین کو لے کر دنیا میں نکلے بہت کم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جن کو بستر کی موت نصیب ہوئی۔

عبداللہ بن رواحہ، زید بن حارثہ، جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہم موتہ میں شہید ہو کر آرام فرما رہے ہیں اور اس لیے ان کو دنیا میں جنت کے پروانے ملے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ابو بکر فی الجنة عمرؓ فی الجنة

عثمانؓ فی الجنه علیؓ فی الجنة طلحةؓ فی الجنة زبیرؓ فی الجنة عبدالرّحمٰنؓ بن عوف فی الجنة ابوعبیدةؓ بن الجراح فی الجنة سعیدؓ بن زید فی الجنة سعدؓ فی الجنة۔﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿ آخرت کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

لَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا عِنْدَ اللّٰہِ تعدل جناح بَعُوْضَۃٍ مَا سَقٰی مِنْھَا کَافِرًا شربۃ ''اگر دنیا کی قیمت اللہ کے یہاں مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ پلاتا۔'' (الحدیث)

دنیا ایک عمارت ہے جس کا بنانے والا اللہ پاک ہے اور بنانے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ مکان پر کتنی لاگت آئی ہے اور بننے کے بعد اس کی کتنی قیمت ہے۔ تو ہم اللہ پاک سے جب پوچھتے ہیں کہ اس دنیا کی قیمت کتنی ہے تو اللہ پاک اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتاتا ہے کہ اس دنیا کی قیمت مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں، اگر ہوتی تو اللہ پاک کافر کو اس کا گھونٹ پانی بھی نہ پینے دیتا۔ قرآن پاک میں بھی ہے

وَلَوْ لَآ اَنْ یَّکُوْنَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً لَّجَعَلْنَا لِمَن

يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ''اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ہو جائیں ایک دین پر تو ہم دیتے اُن لوگوں کو جو منکر ہیں رحمٰن سے اُن کے گھروں کے واسطے چھت چاندی کی اور سیڑھیاں بھی جن پر وہ چڑھیں۔'' (پ۲۵، الزخرف،۳۳)

یعنی دنیا اس حد تک بے قیمت ہے کہ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ مسلمان کافر ہو جائیں گے تو ہم کفار کی چھتوں کو سیڑھیوں کو جن پر چڑھتے ہیں اور دروازے سونے کے بنا دیتے۔

دولت کا مل جانا خدا تعالیٰ کی خوشنودی کی دلیل نہیں، دین کی توفیق مل جانے میں خدا تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ''بیشک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔'' (پ۲۶، الحجرات،۱۳)﴾

دین قیمتی ہے دنیا حقیر ہے اور اللہ پاک اپنے دوستوں کو قیمتی چیز عطا کرتا ہے بے قیمت چیز اللہ پاک دوست کو نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ مقبول بندہ اگر اللہ سے جنت مانگے دے دے گا اور اگر وہی مقبول بندہ خدا تعالیٰ سے کیل مانگے تو نہیں دے گا کیوں کہ یہ دنیا ہے اگر دنیا کی کوئی قیمت ہوتی تو آپ ﷺ کو سب سے زیادہ ملتی مگر

آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں میں آپ کے ساتھ جا رہا تھا انصار کا باغ آیا آپ ﷺ اس میں تشریف لے گئے اور زمین سے گرے پڑے کھجور اٹھا کر مٹی جھاڑ کر کھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھے چار روز سے کھانا نہیں ملا۔

دنیا متاع الغرور ہے دھوکہ اس کو کہتے ہیں کہ ایک چیز واقع میں نہ ہو اور خیال میں واقع ہو۔ دنیا کی ہر چیز اس طرح ہے جوان سمجھتا ہے کہ جوانی رہے گی...... مگر یہ بھول ہے کتنے جوان بوڑھے ہو گئے۔ مال دار سمجھتا ہے دولت رہے گی...... مگر یہ بھول ہے کتنے تندرست تھے جو آج بیمار پڑے ہیں۔ اس دنیا کی خوشی کے بعد غم کے پہاڑ ہیں...... اس کی صحت کے بعد بیماری ہے...... اس کی جوانی کے بعد بڑھاپا ہے...... اور اس کی زندگی کے بعد موت ہے۔ ہمارا سفر لمبا ہے قبر کا راستہ کہ بے نشان ہے زادِ راہ نہ ہونے کے برابر ہے مگر تاجر نے جھوٹ اور وعدہ خلافی کے ذریعہ سفر کو کھوٹا کر دیا، زمیندار نے تکبر اور جہل سے اپنا سفر کھوٹا کر دیا، ملازم نے رشوت اور حاکم نے ظلم کے ذریعہ اس سفر کو کھوٹا بنا دیا۔ انسان کی کامیابی اللہ پاک کی پناہ میں آئے بغیر ناممکن ہے اور اللہ پاک تک پہنچنے کا وسیلہ جناب رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ کی خاطر ہم جان بھی دیں تو کم ہے۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو جب مکہ والوں نے تختہ دار پر کھڑا کر کے اس کے کان، ناک، لبوں کو نیزوں سے چیرنے لگے تو ابوسفیان نے اس وقت کہا کہ تم اتنی بات کہو کہ کاش اس وقت میں مدینہ میں ہوتا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم میری جگہ تختہ دار پر ہوتا تو فرمانے لگے ابوسفیان تجھے دھوکہ لگا ہے اگر ایک جان کی بجائے مجھ میں لاکھ جانیں ہوتیں اور تم ایک ایک کو نکالتے تب بھی میں یہ بات کہنے کو تیار نہ ہوتا، تمہیں دھوکہ ہے۔ میرے آنسو موت کے خوف سے نہیں بلکہ خدا کے خوف سے نکل رہے ہیں اور جب ابوسفیان نے دل مبارک پر نیزا مارا اور جان خدا تعالیٰ کو سپرد کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں فرمایا ﴿وَعَلَيْكَ السَّلَامُ يَا خُبَيْبُ﴾

اُم عمارہ رضی اللہ عنہا کا ایک ہی لڑکا تھا جب مسیلمہ کذاب نے اس کو شہید کر دیا اور ماں کو خبر پہنچی ماں فرمانے لگیں ﴿لِهٰذَا الْيَوْمِ أُرْضِعَتُهُ اسی دن کے لیے اس کو میں نے دودھ پلایا تھا۔﴾

اسلام اپنی کھیتی ہے اس کو ہم سیراب نہیں کریں گے تو یہ کھیتی تباہ ہو جائے گی، کئی کربلائیں گزری ہیں تب یہ اسلام زندہ ہے اور کئی کربلائیں گزریں گی تب یہ قیامت تک زندہ رہے گا۔

﴿روحانی غذا کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبِ ''خبردار! دلوں کا اطمینان اللہ کی یاد میں ہے۔''

دو قسم کی غذائیں ہوتی ہیں ایک جسمانی، دوم روحانی۔ جسمانی غذاؤں کا ہم پہلے استعمال کرتے ہیں بعد میں تعریف کرتے ہیں کھانا عمدہ کھاتے ہیں...... پھر کہتے ہیں بہت اچھا کھانا تھا۔ پھول کو پہلے سونگھ لیتے ہیں...... بعد میں کہتے ہیں بڑا خوشبودار ہے۔ پہلے چیز کو دیکھتے ہیں...... پھر کہتے ہیں بہت خوبصورت ہے۔ پہلے سنتے ہیں...... پھر کہتے ہیں بڑی سریلی آواز ہے۔ مگر روحانی غذاؤں کی تعریف چکھے بغیر کرتے ہیں۔ نماز کی تعریف کریں گے...... مگر پڑھیں گے نہیں، روزہ کی تعریف کریں گے...... مگر رکھیں گے نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اولیاءِ عظام کی تعریفیں کریں گے ...... مگر ان جیسا بنیں گے نہیں۔ اگر کھانے کی تعریف کرنے سے

پیٹ نہیں بھرتا...... پانی کی تعریف کرنے سے پیاس نہیں بجھتی...... شادی کی تعریف کرنے سے بچے پیدا نہیں ہوتے...... تو دین کی تعریف سے ہم دین دار اور اولیاء کیسے بن سکتے ہیں؟

پھر جو چیزیں بدن کے لیے نقصان دہ ہیں ہم نہ صرف ان کی مذمت کرتے ہیں بلکہ ان چیزوں سے مکمل پرہیز بھی کرتے ہیں مثلاً زہر کی مذمت ہم بہت کرتے ہیں مگر زہر سے مکمل پرہیز کرتے ہیں۔

اگر کہیں غلطی سے زہر کو چینی سمجھ کر اٹھا لیتے ہیں تو سمجھنے کے بعد اگر ہاتھ میں ہو اس وقت پھینک دیتے ہیں، منہ میں ہو تو تھوکتے ہیں، پیٹ میں پہنچ چکا ہو تو قے کر لیتے ہیں۔ مگر گناہ روح کے لیے نقصان دہ ہیں ان کی صرف زبان سے مذمت کرتے ہیں مگر عملی میدان میں گناہوں کو نہیں چھوڑتے۔ اگر زہر سے ہم اس لیے بچتے ہیں کہ اس سے دنیاوی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے تو گناہوں سے بھی بچیں کیوں کہ ان سے آخرت کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

بعض لوگ عمل کیے بغیر اولیاء کرام رحمہم اللہ کی تعریف کو کافی سمجھتے ہیں اور دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ﴿ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ ''جو شخص جس سے محبت رکھے اس کے ساتھ ہوتا ہے۔'' (متفق علیہ) ﴾ مگر جواب یہ ہے کہ اس حدیث

مبارک میں عمل کرنے والوں کے لیے ایک تسلی ہے اور وہ تسلی اس طرح ہے کہ اہل سلوک عبادت کرتے ہیں مگر پھر بھی کمی محسوس کرتے ہیں اور اس کمی کے احساس سے بعض اوقات دِل شکنی پیدا ہو جاتی ہے ایسے اہل سلوک کے لیے فرما دیا گیا ﴿اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ﴾ یعنی اگر تم نے کوشش کی مگر پھر بھی کمی رہ گئی تو غم مت کرنا ...... دل کو مت توڑنا ...... پریشان مت ہونا ...... تم ان ہی کے ساتھ ملحق ہو جاؤ گے جن سے تم کو محبت ہے۔ یہ حدیث عمل والوں کے لیے ہے نہ کہ بدعملوں کے لیے۔

یہ یاد رکھیں کہ ہر چیز قابل اعتبار اس وقت ہوتی ہے جب اس پر احکام مرتب ہوں ورنہ نہیں۔ جیسے رائی کا دانہ ترازو میں رکھا جائے تو اس کا وزن ضرور ہوتا ہے اگر ایک دانہ میں وزن نہ ہوتا تو کئی دانوں کے ڈالنے سے ترازو کا پلہ کیسے جھکنا معلوم ہو۔ ہر دانہ میں وزن ضرور ہے مگر چوں کہ اس پر آثار مرتب نہیں ہوتے اس لیے اس کا اعتبار نہیں ہوتا۔ نہ شریعت نے اعتبار کیا نہ اہل عرف نے، گو فلاسفہ کے نزدیک یہ بات مانی ہوئی ہے کہ جب چیونٹی زمین پر چلتی ہے تو ساری زمین کو حرکت ہو جاتی ہے مگر سننے والوں کو تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس پر احکام و آثار مرتب نہیں دیکھے جاتے

اسی طرح شریعت میں وہی چیز قابل اعتبار ہوگی جس پر احکام مرتب ہوں پس محبت وہی معتبر ہوگی جس پر آثار عمل مرتب ہوں۔

بعض لوگ ایک اور جہالت میں گرفتار ہیں کہتے ہیں کہ ہم تو ذات کے عاشق ہیں ہمیں جنت و دوزخ سے کچھ سروکار نہیں۔ اس لیے ہمیں عمل کی کیا ضرورت ہے عمل تو وہ کریں جو جنت کو لینا چاہیں۔ مگر خوب سمجھ لیجئے کہ ذات کے عاشق کو زیادہ عمل کرنا چاہیے جنت تو تھوڑے عمل میں مل جاتی ہے ذات کی طلب میں تو بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ کی ذات تو بہت بڑی ہے۔ جو حضرات ذات کے عاشق تھے ان کا حال یہ تھا ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ "وہ مرد کہ غافل نہیں ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے۔" (پ ۱۸، النور، ۳۷)﴾

یعنی وہ ایسے بندے ہیں جن کو تجارت اور بیع اللہ کے ذکر اور نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر قلب کا فعل ہے اور نماز اعضاء کا عمل ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے مطلب یہ ہے کہ تجارت و بیع ان کو نہ قلب کی عبادت سے غافل کرتی ہے نہ بدنی عبادت سے نہ مالی عبادت سے۔

یك چشم زدن غافل از ان شاه نباشی
شاید کہ نگاهی کند آگاه نباشی

ایک پلک جھپکنے کی مقدار بھی محبوبِ حقیقی سے غافل مت ہو
شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو۔

اہل اللہ کا حال تو یہ ہے ﴿یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ "وہ اس دن سے ڈرتے ہیں کہ اس میں دِل اور آنکھیں اُلٹ پلٹ ہو جائیں گی۔" (پ ۱۸، النور، ۳۷)﴾ اہل اللہ عبادت کر کے ناز نہیں کرتے بلکہ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا "ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام آئے اللہ کا تو ڈر جائیں اُن کے دل اور جب پڑھا جائے اُن پر اُس کا کلام تو زیادہ ہو جاتا ہے اُن کا ایمان۔" (پ ۹، انفال ۲)﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿توکل تسلیم اور اعتماد کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ''تو کہہ یااللہ! مالک سلطنت کے تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت چھین لیوے جس سے چاہے اور عزت دے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے، تیرے ہاتھ ہے سب خوبی، بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔'' (پ۳، آل عمران، ۲۶)

جو اسباب انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں ان سے امید منقطع کریں اور جن اسباب سے نقصان پہنچتا ہے ان کا ڈر دل سے نکال دیں اس کا نام توکل ہے۔ پس نہ تو تجارت صنعت وغیرہ سے امید رکھے کہ چیزیں مجھے رزق دیتی ہیں بلکہ رزق دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہ تو ایک کشکول ہے اس میں کوئی ڈالے گا تو فقیر کشکول میں سے نکال لے گا اگر کشکول میں کوئی ڈالے گا نہیں تو فقیر خاک

نکالے گا۔ تجارت میں بھی اللہ برکت ڈالے گا تو نفع ہوگا ورنہ کچھ بھی نہیں۔ تجارت تو چلنے میں ہماری محتاج ہے ہم اس میں پیسہ ڈالتے ہیں وقت دیتے ہیں تو تجارت چلتی ہے ورنہ نہیں۔ یہی حال ان اسباب کا ہے جو انسان کے لئے نقصان دہ ہیں وہ بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہیں اللہ پاک نہ چاہیں وہ نقصان نہیں دے سکتے۔

آگ نے ابراہیم علیہ السلام کو کیوں نہیں جلایا؟ ...... نیل نے موسیٰ علیہ السلام کو کیوں نہیں ڈبویا؟ ...... مچھلی نے یونس علیہ السلام کو کیوں نہیں ہضم کیا؟ ...... اسماعیل علیہ السلام کو چھری نے کیوں نہیں کاٹا؟ ...... محض اس وجہ سے کہ یہ سب کچھ اللہ کو منظور نہیں تھا۔ تو اسباب کو چھوڑنے کا نام توکل نہیں اسباب کو بے اثر ماننے کا نام توکل ہے۔

لَاتَجْعَلُوا الْاَسْبَابَ اَرْبَابًا

تسلیم یہ ہے کہ اپنا سب کچھ اللہ پاک کے سپرد کریں ﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "اور عزت دے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے تیرے ہاتھ ہے سب خوبی، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔" (پ۳، آل عمران،۲۶)﴾ اللہ پاک چاہے انڈے میں چوزے کو زندگی ملتی

ہے...... خوراک کے بغیر جیتا ہے...... پانی کے بغیر پیاس بجھتی ہے...... ہوا کے بغیر سانس چلتی ہے...... اور اگر نہ چاہے تو مرنے والا کھلی فضا میں دَم توڑتا ہے۔

اعتماد یہ ہے کہ چیزیں خدا تعالیٰ کے حوالہ کرتے وقت بندہ خدا تعالیٰ پر یقین کرے اور بے اعتماد نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو حکم فرمایا ﴿فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ "پھر جب تجھ کو ڈر ہو اُس کا تو ڈال دے اُس کو دریا میں اور نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو ہم پھر پہنچا دیں گے اُس کو تیری طرف اور کریں گے اُس کو رسولوں سے۔" (پ۲۰، القصص، ۷)﴾ پس القیہ تسلیم ہے اور لا تخافی توکل اور لاتحزنی اعتماد ہے۔ توکل جسم کے مانند ہے اور تسلیم آنکھ کے مانند ہے اور اللہ پر اعتماد پتلی کے مانند ہے۔ جیسے پتلی کے بغیر آنکھ بے کار ہے...... اور آنکھ کے بغیر جسم بے کار ہے...... اسی طرح اعتماد کے بغیر تسلیم بے معنی ہے...... اور تسلیم کے بغیر توکل کا کوئی معنی نہیں۔ یا یوں سمجھ لو کہ توکل جسم ہے...... تسلیم قلب ہے اور اللہ پر اعتماد دِل کے اندر خون ہے۔

جسم کی زندگی دِل سے ہے اور دِل کی خون سے ہے اسی

طرح توکل کا وجود تسلیم سے اور تسلیم کا اعتماد سے ہے۔ بلکہ توکل ایک دائرہ ہے اور اعتماد اس کا مرکزی نقطہ ہے اگر مرکز ہل جائے تو دائرہ گول نہیں رہتا اسی طرح اگر اعتماد کمزور ہے تو توکل بھی کمزور رہے گا۔ پس ہمارا فرض ہے خدا تعالیٰ پر توکل کریں اور اپنا خیر و شر اس کے سپرد کریں اور اعتماد کے ساتھ سپرد کریں جیسے وہ اسباب کو بغیر اسباب کے پیدا کر چکا ہے مسبّبات کو بھی اسباب کے بغیر پیدا کر سکتا ہے۔ آگ کو بغیر آگ کے پیدا فرمایا ہے...... پانی کو بغیر پانی کے...... ہوا کو بغیر ہوا کے...... مٹی کو بغیر مٹی کے پیدا فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت مبدی ہے ﴿كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ "جیسا سرے سے بنایا تھا ہم نے پہلی بار پھر اُس کو دوہرائیں گے۔" (پ۱۷، الانبیاء،۱۰۴)﴾ ہم تو کرسی لکڑی سے بنائیں گے مگر اللہ لکڑی کو بغیر لکڑی کے پیدا فرما چکا ہے...... ہم تلوار لوہے سے بنائیں گے اللہ لوہے کو بغیر لوہے کے بنا چکا ہے...... اللہ چیز بنانے میں جیسے مادے کا محتاج نہیں...... ماڈل کا بھی محتاج نہیں...... اس نے سورج کو بنایا بغیر ماڈل کے...... چاند کو بنایا بغیر ماڈل کے...... انسان کو بنایا بغیر نمونے کے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

﴿ محبت الٰہیہ کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

مَنْ تَقَرَّبَ اِلٰى شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلٰى ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعًا وَمَنْ يَاتِيْنِيْ بِمَشِيٍ اَتَيْتُهٗ هَرْوَلَه (الحدیث)

اللہ تعالیٰ کے ہر قانون کو تسلیم کرنا ہمارا فرض بنتا ہے کیونکہ اللہ پاک سے وہ تعلق اگر منکشف ہو جائے تو ہم ضرور احکام الٰہیہ سے رنگین ہو جائیں اور پھر ہم میں دوسرا رنگ رہے نا، اور وہ تعلق محبت اور محبوبیت کا ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو محبت کرنا لازم نہیں؟ اگر ہمیں کسی سے محبت وفضل کمال کی وجہ سے ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر فضل وکمال کا مالک کون ہوسکتا ہے؟ اگر کسی سے ہماری محبت عطا کی وجہ سے ہے تو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر عطا کرنے والا مالک کون ہے؟ اگر کسی سے محبت حسن وجمال کی وجہ سے ہے تو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر حسن وجمال کس میں ہے؟ خدائی

عطا کی یہ کیفیت ہے کہ ہم کو دل دیا...... عقل دی...... زبان دی......
آنکھ ناک دی۔ یہ چیزیں اگر اللہ تعالیٰ عطا نہ فرماتے تو کوئی آپ کو
یہ چیزیں کیونکر عطا کر سکتا۔ اگر کسی میں فضل وکمال ہے حسن و جمال
ہے تو وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے جب انکے بنائے ہوئے ایسے ہیں تو
وہ خود کیسے ہوں گے انکی تو شان ہے۔

حسن خویش از روئے خوبان آشکار کردۂ
پس بہ چشم عاشقان خو را تماشا کردۂ

واقع میں ہماری مثال ایسی ہے جیسے آفتاب نکلا اور دیوار پر
دھوپ پڑی مگر ایک احمق کو آفتاب کی خبر نہیں اس کی نظر دیوار پر ہی
ہے اور دیوار کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہے اور کہتا ہے کہ میرے گھر کی
دیوار کیسی چمک رہی ہے۔ مگر شام ہونا تھی کہ دھوپ سمٹنا شروع ہوتی
ہے اور آفتاب اس کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے تو دیوار تاریک کی
تاریک رہ جاتی ہے۔ نور کی صفت اصلی آفتاب کی ہے دیوار کی
نہیں۔ اگر دیوار کی ہوتی تو اس سے زائل کیوں ہوتی۔

عشق با مردہ نباشد پائیدار
عشق را با حیّ و با قیوم دار

پس عشق حق تعالیٰ ہی کا حق ہے۔

جس کی شان یہ ہے ﴿ مَنْ تَقَرَّبَ اِلَی شَبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَی ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا وَمَنْ یَاتِیْنِیْ بِمَشِیٍ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَه (او کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم) ''جو میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک ذراع جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ذراع آتا ہے میں اس کی طرف ایک باع (یعنی دو ہاتھ) جاتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔'' ﴾ اگر یہ نہ ہوتو یہ راستہ کسی کے قطع کرنے سے قطع نہیں ہوسکتا۔

مگراس کے لئے طلب شرط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کھینچتے اسی کو ہیں جو کھنچنا چاہے اور جو اعراض کرتا ہے اس سے وہ بھی اعراض کرتے ہیں چناں چہ ارشاد ہے ﴿ اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا کَارِهُوْنَ ﴾ یعنی تم کراہت کروتو ہمیں کیا غرض پڑی ہے جو خواہ مخواہ اپنی رحمت کو تم پر لادیں۔

لیکن اگر کوئی طلب کرے تو اس کی طرف نہایت توجہ اور رحمت فرماتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ ماں کی آغوش میں دوڑ کر آنا چاہتا ہے مگر گھٹنوں سے چلا نہیں جاتا وہ ہمت کر کے کھڑا ہوا اور گر پڑا اس کا گرنا تھا کہ ماں نے دوڑ کر خود اُٹھا لیا بچے کا کام

بس اتنا تھا کہ اپنی ہمت کے مطابق چلے اور گر پڑے جب وہ اپنا کام کر چکتا ہے تو فوراً آغوش میں اُٹھا لیا جاتا ہے اگر بچہ ایسا نہ کرے تو اس کی طرف ماں کو ایسا تقاضا نہیں ہوتا اس کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں

گرچہ رخنہ نیست عالم لا پدید
خیرہ یوسف دار می باید دوید

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا مکان میں لے گئیں تو سات قفل سات دروازوں میں ڈال دیئے تھے تاکہ نکلنے نہ پائیں جب انہوں نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ اپنا کام مجھے کرنا چاہئے پھر حق تعالیٰ اپنا کام کریں گے دروازہ کھلنا نہ کھلنا میرا کام نہیں بس خدا پر توکل کر کے دروازہ کی طرف بھاگے دروازے کے پاس پہنچنے نہ پائے تھے کہ سب دروازے کھلتے چلے گئے یہاں تک کہ سب دروازوں سے باہر نکل گئے۔

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید
خیرہ یوسفؑ دارمی بایددوید

خدا تعالیٰ کے تعلق کے لئے اول شرط یہ ہے کہ ہم گناہ چھوڑیں کیونکہ گناہ سے تعلقات خراب ہوتے ہیں دوسری شرط یہ

ہے کہ فرائض کی پابندی کریں۔ کیونکہ فرائض کا چھوڑنا لاتعلقی ہے۔ گناہ چھوڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا خوف ضروری ہے اور فرائض کی پابندی کے لئے خدا تعالیٰ سے محبت ضروری ہے۔ اللہ ہمیں اپنی محبت اور خوف عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿جاہ سے بچنے کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ ''کہ جو شخص اللہ کے واسطے تواضع اختیار کرے گا اللہ اس کو بلند کرے گا''

حصولِ جاہ کے چند مراتب ہیں ایک یہ ہے کہ جاہ بدون حاصل کیے حاصل ہوگئی ہے وہ خالص نعمت ہے خدا تعالیٰ کی۔ جیسے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام رحمہم اللہ کی جاہ ہوتی ہے کہ وہ خود گرتے چلے جاتے ہیں اور پستی اختیار کرتے ہیں مگر وہ جتنے گرتے ہیں اتنے ہی بلند ہوتے ہیں کیوں کہ حدیث شریف میں ہے ﴿مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ کہ جو شخص اللہ کے واسطے تواضع اختیار کرے گا اللہ اس کو بلند کرے گا۔﴾

اس کو جو جاہ ملی ہے اس نے خود حاصل نہیں کی بلکہ اللہ کی طرف سے ملی ہے اس جاہ کے خالص نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دوسری صورت جاہ کی یہ ہے کہ جاہ اس نے تو حاصل نہیں کی

مگر دوسروں نے جاہ تک پہنچا دیا مثلاً چار آدمیوں نے مل کر اس کو بادشاہ بنا دیا اب یہاں جاہ تو حاصل ہوگئی اسباب سے مگر اس نے وہ اسباب جمع نہیں کیئے بلکہ لوگوں نے اسباب جمع کر کے اس کو بادشاہ بنا دیا ہے۔ پہلی اور اس صورت میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں تو اسباب ظاہری جمع ہی نہیں کیے گئے نہ اس کی طرف سے نہ اوروں کی طرف سے بلکہ محض قدرتی طور سے جاہ مل گئی اور یہاں گو اس نے اسباب کو جمع نہیں کیا مگر دوسروں نے تو جمع کیا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اس صورت میں صاحب جاہ انکار کر کے جاہ سے بچ سکتا ہے بخلاف پہلی صورت کے کہ وہاں بچ نہیں سکتا کیوں کہ وہ غیر اختیاری ہے۔

اس دوسری جاہ کا دو شرطوں کے ساتھ قبول کرنا جائز ہے ایک تو یہ ہے کہ دوسروں کو راحت پہنچائے دوم یہ ہے کہ اپنا دین کسی حال میں برباد اور تباہ نہ ہو۔ ان دونوں باتوں پر نظر کر کے اس جاہ کا قبول کرنا جائز ہے اور اگر یہ شرطیں نہ پائی جائیں تو قبول کرنا حرام ہیں۔ تیسری قسم جاہ کی یہ ہے کہ نہ کسی نے بادشاہ بنایا ہے نہ قدرتی طور پر جاہ ملی ہے بلکہ خود کوشش کرتا ہے جاہ کے حاصل ہونے کی جیسے موجودہ حکمران ایک کو اتار کر سلطنت پر قبضہ کرتے ہیں اس کا

حکم یہ ہے کہ بجز خاص خاص حالات کے ایسا کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اصل قانون تو یہ ہے کہ اپنے لیے خود کوئی منصب تجویز کرنا اور اس کی خواہش کرنا جائز نہیں ہے اسی میں سب عہدے حکومت کے داخل ہیں۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ جو حکومت کی درخواست کرے ہم اس کو کبھی حکومت نہ دیں گے راز اس میں یہ ہے کہ حکومت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے اور بڑا بوجھ اٹھانا ہے۔ اگر دس پر حاکم ہے تو دس کا بوجھ اٹھانا ہے اور اگر پچاس پر حاکم ہے تو پچاس کا بوجھ اٹھانا ہے اور اگر ایک پر ہے تو ایک کا بوجھ اٹھانا ہے اور یہ بوجھ اٹھانا نہایت دشوار کام ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مقام پر پہنچے آپ کو ایک خیمہ جنگ میں نظر آیا آپ اس خیمہ کے باہر کھڑے ہو گئے دیکھا کہ اس میں بچوں کے رونے کی آواز آرہی ہے اور گویا یہ تجسس تھا مگر امام وقت کو تفتیش اور تجسس جائز ہے دوسرے کا جائز نہیں۔ غرض آپ کو معلوم ہوا کہ ایک خاندان باہر سے آ کر ٹھہرا ہے ان کے بچے بھوک سے چلا رہے ہیں کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ بی بی نے ایک دیگچی چڑھا رکھی ہے اور بچوں سے کہہ رہی ہے کہ تم سو جاؤ کچھ دیر میں کھانا پکا کر تمہیں اٹھالیں گے اس حالت کو دیکھ کر آپ بے حد دل گیر ہوئے

پھر آپ ان کے سامنے کھڑے ہوگئے وہاں کوئی فیشن تو تھا نہیں جس سے شناخت ہوتی کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کون ہے۔ آپ نے ان سے خود فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر اپنے حال کی اطلاع کرو وہ تمہیں کھانے پینے کا سامان دیں گے تو وہ عورت کہتی ہے سبحان اللہ! یہ ہمارے ذمہ ہے یا ان کے ذمہ ہے کہ وہ خود ہماری خبر رکھیں انہوں نے خلافت کیوں اختیار کی ہے آپ نے فرمایا کہ عمر غیب دان نہیں ہے اس عورت نے کہا کہ پھر کیوں خلافت کا منصب اختیار کیا ہے چھوڑ دیا ہوتا۔ بس یہ سن کر آپ واپس ہوئے اور اسی وقت بیت المال کا قفل کھولا اور کچھ آٹا اور جنس اپنے ساتھ لیا غلام نے کہا کہ یہ سامان میرے حوالے کیجئے میں لے چلوں گا تو آپ فرماتے ہیں ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی "اور کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے کا" (پ ۱۵، بنی اسرائیل، ۱۵)﴾ فرمایا یہاں کا بوجھ اٹھانا سہل ہے آخرت کا بوجھ اٹھانے سے۔ آپ لے کر وہاں پہنچے اور ان سے کہا کہ اس کو کھاؤ پیو۔

اسی طرح آپ شب کے وقت ایک بار گشت کرتے پھر رہے تھے ایک خیمہ دیکھا اور اس میں سے دردناک آواز سنی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ایک عورت کا بچہ پیدا ہونے والا ہے آپ نے کہا کہ

تم نے کسی دایہ کو نہیں بلایا وہ لوگ کہنے لگے ہم پردیسی ہیں ہمارے پاس کون ہے بلانے والا۔ آپ فوراً اپنے گھر گئے اور اپنی بیوی کو وہاں سے لائے اور ان سے کہہ دیا کہ ظاہر نہ کرنا کہ میں خلیفہ کی بیوی ہوں جب بچہ پیدا ہوا اور ان کے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ نکل گیا ﴿أَبْشِرْ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِيْن بشارت ہو آپ کو یا امیر المؤمنین﴾ اس سے سب کو پتہ چل گیا یہ امیر المؤمنین ہیں۔ حاکم کے لئے مخلص ہونا ضروری ہے اور اخلاص کی تین نشانیاں ہیں ایک یہ ہے کہ اس سے اچھا انسان ملے تو یہ اپنا عہدہ اس کے لئے چھوڑ دے کہ اب تم حاکم بنو...... مفتی بنو...... امام بنو...... راہنما بنو۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ اپنے عہدہ سے بڑا عہدہ نہ طلب کرے کیونکہ خدمتِ خلق جیسے بڑے عہدے میں ہے ایسے ہی چھوٹے عہدے میں ہے۔ تیسری نشانی یہ ہے کہ عہدوں کی تقسیم قرابت اور دوستی کی بنیاد پر نہ کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انتظام کیا تھا کہ میری خلافت میں بنی عدی میں سے کوئی حاکم نہ بنایا جائے (بنی عدی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبیلہ اور خاندان ہے) کیونکہ وہ میرے اثر سے دوسروں کو ستا سکتا ہے مگر ایک شخص کو لیاقت کی وجہ سے حاکم بنا دیا تھا اس نے کچھ

اشعار کہے تھے جس میں اپنی بیوی کو خطاب تھا کہ وہاں رہیں گے اور عیش وعشرت کریں گے وہ اشعار آپ کے پاس پہنچ گئے آپ نے اس کی حاضری کا حکم دیا اور پوچھا کہ یہ تمہارے اشعار ہیں اس نے کہا ہاں۔آپ نے فرمایا کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیت یہ ہے کہ خوب عیش اڑائیں گے اس نے کہا کہ حضرت یہ تو زبانی شاعری تھی دل سے کوئی واقعی مضمون نہ تھا۔آپ نے فرمایا زبان پر کسی بات کا تذکرہ اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک دل میں نہ ہو،تم قابل حکومت نہیں ہو اور معزول کر دیا۔اسی معیار کے مطابق واعظ بھی اپنے آپ کو بنائے...... مفتی بھی...... پیر بھی...... یہ اسلامی قانون ہے۔

﴿طَالِبُ التَّوْلِيَه لَا يُولِي ﴾ جو خود حکومت کرے اس کو حاکم نہ بنایا جائے ہاں اگر کوئی عہدہ خالی ہو اور کوئی اہل موجود نہ ہو اور ظاہراً یہ شخص اس کا اہل ہے ایسے شخص کو درخواست کرنا درست ہے دلیل اس کی حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ السلام کا واقعہ ہے کہ جب بادشاہ نے ان سے کہا کہ اتنا بڑا کام یعنی قحط عام کا انتظام کون کرے تو انہوں نے فرمایا کہ میں کرسکتا ہوں۔چناں چہ ان کا مقولہ یہ ہے کہ ﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ

عَلِيْمٌ "یوسف نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا۔" (پ۱۳، یوسف، ۵۵) ﴾ یعنی مجھ کو غلہ کے خزانوں پر مقرر کر دیجیے میں اس کی خوب نگرانی کروں گا، میں اس کے طریقوں کو جانتا ہوں۔

درخواست جائز ہونے کی یہاں بھی دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ مال مقصود نہ ہو، دوسرے یہ جاہ مقصود نہ ہو۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿اصلاح اوقات کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اِمَّا اِلَی الْجَنَّۃِ وَ اِمَّا اِلَی النَّار

جنت میں جانے کے لئے اور اللہ پاک سے ملنے کے لئے آسان راستہ جس میں زیادہ مشقت اور تھکاوٹ بھی نہ ہو یہ ہے کہ انسان غور کرے کہ میری زندگی کے تین حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جو گزر چکا ہے یعنی ماضی۔ دوسرا وہ ہے جو ابھی آیا نہیں ہے یعنی مستقبل۔ اور تیسرا حصہ وہ ہے جو ماضی اور مستقبل کے درمیان میں ہے یعنی حال، حاضر۔

اب اللہ پاک تک پہنچنے کے لئے تینوں حصوں کی اصلاح ضروری ہے مگر یہ اصلاحات بہت آسان ہیں ماضی کی اصلاح محض توبہ اور اپنے گناہوں پر ندامت سے ہوگی اور توبہ اور ندامت میں کوئی تھکاوٹ نہیں کیونکہ توبہ اور ندامت قلبی چیزیں ہیں اعضاء کا ان میں دخل نہیں۔ مستقبل کی اصلاح عزم اور ارادہ سے ہوتی ہے کہ

انسان عزم کرے آئندہ نہ کرنے کا۔ اور ارادہ و عزم میں بھی جسمانی تھکاوٹ نہیں ہوتی ارادہ محض قلب کا کام ہے۔ پس ماضی کی اصلاح توبہ سے اور مستقبل کی اصلاح عزم و ارادہ سے اور ان دونوں میں جسمانی اعضاء کا دخل نہیں۔ لہٰذا ان میں کوئی تھکاوٹ مشقت نہیں۔ تیسری اصلاح وقت حاضرہ کی ہے اور یہ چار امور سے ہوتی ہے۔ اول یہ کہ اس میں ماضی کے گناہوں سے توبہ ہو، دوم یہ کہ اس میں مستقبل کے بارے میں مضبوط عزم ہو گناہ نہ کرنے کے، سوم یہ کہ اس میں صبر ہو گناہوں سے، چہارم یہ کہ اس میں صبر ہو عبادت کرنے پر۔

پس وقت حاضر میں ہر انسان اپنی آخرت کے لئے زاد اور توشہ جمع کرسکتا ہے ﴿اِمَّا اِلَی الْجَنَّۃِ وَ اِمَّا اِلَی النَّار﴾ اگر انسان وقت حاضرہ میں وہ چار کام کریں جو ہم نے بیان کیے ہیں تو دائمی جنت میں پہنچے گا اور اگر وقت حاضر میں شہوات و خواہشات کی اتباع کرے گا تو دائمی آگ کا سامان کرے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج گناہوں سے صبر اور طاعات پر صبر بہت مشکل ہے مگر آخرت میں آگ پر صبر اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ آج کم تکلیف کو برداشت کر کے آخرت کی بڑی تکلیف سے اپنے

آپ کو بچائیں۔

پس سعادت کاملہ یہ ہے کہ ہم ماضی کے گناہوں پر افسوس کریں، مستقبل میں گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کریں اور حال میں گناہ سے اور طاعت پر صبر کریں اور اس کے علاوہ ہمارا کوئی کام نہ ہو، اور جب لوگ دنیا میں مشغول ہوں...... تو ہم اللہ کی رضا حاصل کرنے میں مشغول ہوں، اور جب لوگ دنیا حاصل ہونے پر خوش ہوں ...... تو ہم رب کی رضا حاصل ہونے پر خوش ہوں، اور جب لوگ احباب سے اُنس کریں...... تو ہم اللہ تعالیٰ سے اُنس کرنے والے بنیں، اور جب لوگ اپنے کبراء کے جانے سے فخر کریں ...... تو ہم خدا تعالیٰ کے پاس جانے پر فخر کریں، اور جب لوگ ہمارے لئے آخرت کو چھوڑتے ہیں...... تو ہم ان کے لئے دنیا چھوڑ دیں۔

مسلمان کھجور کی طرح بن جائے جب کھایا جائے تب میٹھا اور جب کھلایا جائے تب میٹھا اور اگر درخت سے گرے تو نہ ہڈی توڑتا ہے نہ زخمی کرتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ اللہ تعالیٰ کو سہارا ماننے کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

قَالَ كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ”کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ ہے میرا رب، وہ مجھ کو راہ بتلائے گا۔“ (پ۱۹، الشعراء، ۶۲)

اگر ہم پیسے کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر کریں اور پیسے پر ہمارا یقین بن جائے تو جو لوگ پیسے میں ہم سے زیادہ ہوں گے وہ ہمارے مقابلہ میں کامیاب ہوں اور دوسرے یقیناً ہم سے پیسے میں زیادہ ہیں تو ہم ناکام رہیں گے اور اگر ہمارا یقین حکومت پر بن جائے تو جو لوگ ہم سے حکومت میں طاقت ور ہوں گے ہم ان کے مقابلہ میں خوار ہوں گے اور اگر ہمارا یقین اسلحہ اور فوج پر آجائے تو جن کی فوج و اسلحہ ہم سے زیادہ ہیں وہ ہمارے مقابلہ میں کامیاب ہوں گے اور ہمارے یقین خدا تعالیٰ پر آجائے تو اللہ تعالیٰ سے طاقت ور کوئی نہیں جب ہم اللہ کو راضی کریں اور وہ ہمارا سہارا بن جائے تو کوئی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

دیکھئے موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر صبح کے وقت نیل کے کنارے پہنچے، فرعون سمیت لاکھوں افواج نے پیچھا کیا ہے چوں کہ بنی اسرائیل کا یقین اللہ پر نہیں بنا تھا تو ان کی چیخیں نکلیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یقین اللہ پر بن چکا تھا تو فرمانے لگے ﴿قَالَ كَلَّآ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ "کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ ہے میرا رب وہ مجھ کو راہ بتلائے گا" (پ۱۹، الشعراء، ۶۲)﴾ اور اس یقین کی بنیاد اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو بارہ راستے دیئے۔ اس یقین کی بنیاد پر اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے، یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے، یوسف علیہ السلام کو سات مقفل کمروں سے نکالا۔

سپر طاقت اللہ ہی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں سپر طاقت وزیراعلیٰ ہے..... وہ سمجھتا ہے کہ سپر طاقت وزیراعظم ہے..... وہ سمجھتا ہے سپر طاقت صدر ہے..... صدر سمجھتا ہے سپر طاقت امریکہ **لعنة اللہ علیہ** ہے..... مگر یہ سب زیرو ہیں۔ سپر طاقت وہ ہوتا ہے جو مجبور نہ ہو اور یہ سب مجبور ہیں یہ سب مل کر بھی اونٹ کو سوئی کے ناکے سے نہیں گزار سکتے مگر اللہ اس پر قادر ہے کہ اونٹ کا جسم چھوٹا نہ ہو اور ناکہ وسیع نہ ہو اس کے باوجود اس بڑے اونٹ کو اس چھوٹے سے سوراخ سے گزار

دیں گے جیسے آنکھ کی پتلی میں آسمان سما جاتا ہے اور چھوٹے سے دماغ پر دنیا کا نقشہ سما جاتا ہے۔ لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ کو سہارا بنائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿ اصلاح قلب کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ''وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔'' (پ۲۷، الحدید،۳)

دو متضاد چیزیں ایک وقت کے اندر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں مثلاً اگر برتن میں آگ کے انگارے ہوں تو اس میں پانی داخل نہیں ہوسکتا، اگر برتن میں تری ہو تو خشکی نہیں رہے گی، اگر خشکی ہو تو تری نہ ہو گی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک پھول بیک وقت خوشبودار بھی ہو اور بدبودار بھی ہو، اگر کوا کالا سیاہ ہے تو لال سرخ کیسے ہوسکتا ہے؟

اسی طرح انسانی قلب کے اندر کفر بھرا ہوا ہو تو اس میں ایمان کیسے آئے گا؟ دنیا کی محبت ہو تو آخرت کی محبت کیسے آئے گی؟ اللہ ورسول کی محبت ہو تو غلط خواہشات اس میں نہیں آسکتیں۔

پس دل میں حق ہوگا یا باطل، نیکی کا شوق ہوگا یا برائی کا۔

دیکھئے انسان کے تمام اعضاء ایک وقت میں ایک کام کر سکتے ہیں اگر آنکھیں مشرق کی طرف دیکھیں تو باقی تینوں جہات سے محروم ہیں۔ اگر کان ایک بات کی طرف متوجہ ہوں تو اس وقت دوسری بات سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ پاؤں ایک وقت میں ایک طرف چل سکتے ہیں نہ کہ چاروں طرف۔ زبان ایک وقت میں ایک ہی بات کر سکتی ہے۔ اسی طرح دل کے اندر دین ہوگا یا دنیا ہوگی...... حق ہوگا یا باطل...... اللہ تعالیٰ کی طرف جھکاؤ ہوگا یا غیر اللہ کی طرف...... اس میں خشیت ہوگی یا جرأت...... اس میں اگر علم ہو تو جہل نہ ہوگا...... اور اگر جہل ہو تو علم کیسے؟

لہٰذا ہم اپنے قلب میں علم اتاریں...... تاکہ جہل نکل جائے۔ حق اُتاریں...... تاکہ باطل نہ آنے پائے۔ دین اُتاریں ...... خدا تعالیٰ کی محبت اتاریں ...... تاکہ غیر اللہ ہمارے دِلوں سے نکل جائے۔

ایک پردہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے وہ یہ کہ غلط عقائد، غلط اخلاق، غلط قسم کے اعمال، غلط معاملات اور معاشرت سے اجتناب کریں۔ دوسرا پردہ ہمارے اور مخلوق کے درمیان ہے وہ

یہ ہے کہ ہمارے عیوب ڈھکے چھپے رہیں۔ ہم جب تک اس پردے کی حفاظت کرتے رہیں گے جو ہمارے اور خدا عزوجل کے درمیان ہے یعنی گناہوں سے بچتے رہیں گے تو اللہ وہ پردہ چاک نہیں فرمائیں گے جو ہمارے اور مخلوق کے درمیان ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے عیوبات کی ستر پوشی کرتے رہے گے اور اگر ہم اس پردہ کو چاک کر دیتے ہیں جو ہمارے اور خدا تعالیٰ کے درمیان ہے تو اللہ تعالیٰ اس حجاب کو اٹھا دیتا ہے جو ہمارے اور مخلوق کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ ہمارا ایک رب ہے اور ایک گھر (قبر) ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ رب سے ملنے سے پہلے اس کو آباد کریں۔

وقت کا ضیاع موت سے زیادہ خطرناک ہے کیوں کہ موت دنیا چھڑواتی ہے اور ضیاعِ وقت ہم کو رب سے چھڑانے کا باعث ہے۔ یہ مسلمان اگرچہ عمرِ نوح پالے تب بھی دو چیزوں سے فارغ نہیں ہوسکتا اپنے اوپر رونے سے اور ثناءِ باری تعالیٰ سے۔ لہٰذا ہم ہمیشہ اپنی کوتاہیوں پر روئیں اور اللہ تعالیٰ کی ثناء کرتے رہیں اور اللہ کی قضاء پر راضی رہیں۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ اگر ہمیں کوئی چیز نہیں دیتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ چیز اللہ کے پاس نہیں ہے یا اللہ بخل کرتا ہے

(العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ ان دونوں سے پاک ہے بلکہ نہ دینے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ چیز ہمارے حق میں نقصان دہ ہوتی ہے اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ہر قضاء پر راضی رہیں اس کی قضاء پر عدم رضاء ہمارے لئے خطرناک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی تو عزازیل نے عدم رضاء کا اظہار کیا، اللہ نے آدم کے سامنے سجدے کا حکم صادر فرمایا اس نے پھر عدم رضاء کا اظہار کیا۔ اس عدمِ رضاء کی وجہ سے ابلیس ملعون بنا...... آدم نے خلودِ جنت درخت میں سمجھی...... اسی وقت جنت سے نکالے گئے، یوسف علیہ السلام نے رہائی ایک قیدی سے طلب کی...... سات برس جیل میں رہے، زکریا علیہ السلام نے درخت کی پناہ مانگی...... سرمبارک سے پیر تک چیرے گئے، بس اللہ ہی اللہ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ''وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔''(پ ۲۷، الحدید، ۳) ﴾

جب لوگ دنیا سے خوش ہوں تو ہم دین اپنا کر خوش ہو جائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ اخلاص کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

''اوران کوحکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص عمل کے ساتھ خدا کی عبادت کریں۔'' (سورۃ البینۃ، آیت ۵)

اخلاص حاصل کرنے کی چار شرطیں ہیں ایک یہ کہ نیک عمل میں خواہشاتِ نفس کی آمیزش نہ ہو مثلاً یہ نیت نہ ہو لوگ مجھے نیک سمجھ کر مجھ سے عقیدت و محبت رکھیں یا لوگ میری تعریف کریں یا میری مذمت سے رک جائیں مجھے مال دیں۔ دوم شرط یہ کہ اپنی نیکی پر نظر نہ ہو کہ یہ میری نماز ہے، میرا حج ہے، میری سخاوت ہے، اپنی طرف نسبت نہ کرے۔ سوم یہ کہ نیک عمل کا معاوضہ اپنا حق نہ سمجھے۔ چہارم یہ کہ نیکی سے مطمئن نہ ہو کہ میں نے حق ادا کر دیا ہے۔

اگر نیکی میں خواہشات کی آمیزش ہو تو یہ ریاء اور ریاء شرک خفی ہے لہٰذا نیک عمل میں انسان نفسانی خواہشات سے بچے اور نیک عمل کی طرف ہم اس لئے نہ دیکھیں کہ ہماری نیکی ہمارا کمال

نہیں، ہم نیکی محض اللہ پاک کی توفیق وفضل سے کرتے ہیں۔ نماز میں قیام، رکوع وسجدہ ان ہی پاؤں سے کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں اور ان کمر اور پیشانی سے کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں۔ صرف یہ نہیں بلکہ اللہ کے ارادے سے کرتے ہیں ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ہماری نماز والی حرکت تو ایسی ہے جیسے اشجار اور ہواؤں کی حرکت۔

لقولہٖ تعالیٰ: ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ مَا زَکٰی مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ۔﴾ وَقَالَ اللّٰہ تعالیٰ فی حق اهل الجنة: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا﴾ وَقَالَ اللّٰہ تعالیٰ لرسوله: ﴿وَلَوْ لَا اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا﴾ وَقَالَ اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ"۔﴾

پس انسان کی ہر نیکی محض خدا کی توفیق اور فضل سے وجود میں آتی ہے اس میں انسان کا کوئی کمال نہیں ہے۔ پس انسان کا اپنے اعمالِ صالحہ پر فخر ایسا بے کار ہے جیسا کہ انسان کا اپنے کان، ناک اور آنکھ، چہرے کے حسن پر فخر بے کار ہے کیونکہ یہ اعضاء اور ان کا حسن بھی انسان کے اختیار میں نہیں۔ اور ہم اعمال کے بدلے

عوض کے مستحق اس لئے نہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کے غلام ہیں اور غلام کو حق نہیں کہ اپنی خدمت کا معاوضہ طلب کرے۔ تو ہم کو اگر اعمال کا ثواب ملتا ہے تو یہ محض اللہ کا فضل ہے اور احسان ہے نہ کہ ہمارا حق ہے۔ العیاذ باللہ، اور ہم اپنے اعمال صالحہ سے مطمئن نہ ہوں کیونکہ ہماری نیکی میں چونکہ خواہش کی آمیزش ہوتی ہے اس لئے وہ اللہ کے دربار میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہے جب قابل نہیں تو ہم کیسے ان اعمال سے مطمئن ہوں؟ بعض اہل اللہ ہر روز چار سو رکعت نوافل پڑھتے تھے پھر بھی اپنی داڑھی پکڑ کر اپنے آپ کو ملامت کرتے تھے۔ (مدارج السالکین ۴۷ ج ۲)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿ دعوت وتبلیغ کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ "بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اُسے دشمن سمجھو، وہ تو اپنے گروہ کو اسی لیے بلاتا ہے کہ دوزخیوں میں ہوں۔" (پ۲۲، فاطر،٦)

شیطان انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے اور کھلا دشمن ہے۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن حکیم جو انسانوں کیلئے ہدایت اور ہر مرض سے شفاء ہے اس میں انسان کے اس خطرناک دشمن کا مختلف ناموں سے ۷۴ بار ذکر کیا گیا ہے اور رب کریم نے اپنے بندوں کو اس کے مکاری، چالبازیوں اور اس کی دشمنی سے واقف کرانے کا پورا انتظام کیا ہے۔ اس لئے اس کے مکر اور مکاریوں کا وضاحت سے ذکر کیا ہے۔

اور شیطان انسان کا دشمن اس لئے ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ مجھے حقیقی زندگی ملے ...... اور چاہتا ہے کہ مجھے خوشحالی ملے ......

اور یہ بھی چاہتا ہے کہ مجھے صحت بھی ملے ...... اور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ میری آخرت بھی اچھی ہو۔ مگر حقیقی زندگی ملتی ہے ایمان سے ...... اور خوشحالی ملتی ہے نیک اعمال سے ...... اور صحت ملتی ہے تقویٰ سے ...... اور آخرت بنتی ہے ایمان، نیکی اور تقویٰ سے۔ تو شیطان ایمان پر ڈاکہ ڈال کر ہم سے حقیقی زندگی چھیننا چاہتا ہے۔ اعمال لوٹ کر خوش حالی سلب کرنا چاہتا ہے۔ گناہ کروا کے صحت کا دشمن بنتا ہے اور ایمان ...... اعمال ...... تقویٰ پر ڈاکہ ڈال کر ہماری آخرت تباہ کرنا چاہتا ہے اس لیے ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا یَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِیَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ "بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اُسے دشمن سمجھو وہ تو اپنے گروہ کو اسی لیے بلاتا ہے کہ دوزخیوں میں ہوں۔" (پ۲۲، فاطر،٦)﴾

اور انسان کے سب سے بڑے ہمدرد اور خیر خواہ انبیاء علیہم السلام ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام نے دیکھا کہ انسان کی حقیقی زندگی ایمان کی بدولت ہے تو انہوں نے انسان کو ایمان کی دعوت دی اور جب دیکھا کہ انسان کی خوش حالی اعمالِ صالحہ میں ہے تو انہوں نے انسان کو اعمالِ صالحہ کی دعوت دی ...... اور تقویٰ کی

دعوت دے کر انہوں نے ہماری صحت کا سامان کیا...... اور ایمان کی دعوت دے کر انہوں نے ہماری آخرت بنانے کی کوشش کی۔ ﴿اعلی اللّٰہ دَرَجَاتھمْ فِی جَنّٰتِ النَّعِیْم۔﴾ اس لیے دنیا کا کوئی علاقہ اور کوئی زمانہ ایسا نہیں جب اللہ نے ان مبارک نفوسِ قدسیہ اور انسانیت کے خیر خواہوں کو نہ بھیجا ہو۔ ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ ''اور کوئی فرقہ نہیں جس میں نہیں ہوا کوئی ڈر سنانے والا۔'' (پ۲۲، الفاطر، ۲۴)﴾

سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ سے قبل تقریباً سوا لاکھ انبیاء کرام اور رسول علیہم السلام دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں تشریف لائے جو آخری درجہ کی دردمندی اور فکرمندی کے ساتھ اپنی قوموں کو ایمان وعملِ صالحہ کی دعوت دیتے رہے۔ سب سے آخر میں انبیاء کرام علیہم السلام کے سردار رحمۃ للعالمین جناب رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے۔ آپ کی بعثت زمان و مکان سے ماوراء تا قیامت تمام انسانوں کے لیے تھی۔ آپ ﷺ کے دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد ان کی اُمت کو خیر اُمت بنا کر یہ اعزاز بخشا گیا ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ''تم ہو بہتر سب اُمتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں، حکم کرتے

ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔" (پ ۴، آل عمران) ﴾ کہ کارِ نبوت یعنی دعوتِ دین کے منصب پر اس کو فائز کیا گیا۔ اس لیے شیطان اور اس کی جماعت کو سب سے زیادہ دشمنی انبیاء کرام علیہم السلام کی مقدس جماعت اور ان کے بعد اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے خصوصاً ان خوش قسمت افراد سے ہے جو دعوتِ دین اور کارِ نبوت کی نیابت کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔

ایک عجیب غلط فہمی جس کو شیطان نے ملت کے ذہن میں ڈال دیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف مسلمانوں کے رب ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف مسلمانوں کے رسول ہیں...... اور اسی طرح قرآن مجید صرف مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہے...... اور اسلام صرف مسلمانوں کے لیے قانون ہے...... جس طرح عیسیٰ علی نبینا و علیہ السلام عیسائیوں کے رسول ہیں...... اور انجیل صرف عیسائیوں کا مخصوص مذہب ہے ...... اور جس طرح موسیٰ علیہ السلام یہودیوں کے رسول ہیں ...... اور توراۃ صرف یہودیوں کی کتاب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب اللہ کے بارے میں ایسا خیال ظلم عظیم اور دعوتِ دین کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اس وجہ سے سارے غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف مسلمانوں کا

رسول اور قرآنِ کریم کو تنہا مسلمانوں کی مذہبی کتاب سمجھتے ہیں۔ جبکہ قرآن پوری انسانیت کو خطاب کرتا ہے:

۱) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا
''تو کہہ اے لوگو! میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف۔''

(پ۹، الاعراف، ۱۵۸)

۲) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ''اور اے محبوب! ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام انسانوں کو گھیرنے والی ہے، واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔''

(پ۲۲، سبا، ۲۸)

۳) تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ''بڑی برکت والا ہے وہ کہ جس نے اُتارا قرآن اپنے بندہ پر جو سارے جہان کو ڈر سنانے والا ہو۔''

(پ۱۸، الفرقان، ۱)

۴) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا لوگوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں۔'' (پ۲، البقرۃ، ۱۵۸)

۵) یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ "اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا، یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔" (پ۱، البقرۃ، ۲۱)

پہلی، دوسری اور تیسری آیت سے معلوم ہوتا ہے آپ کی نبوت صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہے۔ چوتھی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم قیامت تک تمام انسانوں کے لیے اللہ کا اَبدی قانون ہے۔ اور پانچویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ہی پوری کائنات کے خالق و مالک اور معبود ہیں۔ اورصرف اسلام ہی پوری انسانیت کے لیے قابلِ قبول دین ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مذہب بھی کسی انسان کے لیے قابل قبول اور قابل عمل نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ "اور جو اسلام کے سوا کوئی دین چاہے گا وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔" (پ۳، آل عمران، ۸۵)﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ نفع بخش تجارت کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ○ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ”بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور نماز قائم رکھتے اور ہمارے دیئے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں پوشیدہ اور ظاہر وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں ہرگز نقصان نہیں۔“ (پ۲۲، الفاطر، ۲۹۔۳۰)

دنیا میں ہر شخص نفع کے حصول میں سرگرم نظر آتا ہے حتی کہ آج تمام محنتیں نفع ہی کے گرد گھوم رہی ہیں اگر تجارت ہے تو نفع کے لیے...... صنعت ہے تو نفع کے لیے...... زراعت، ملازمت ہے تو نفع کے لیے...... منصب اور عہدہ ہے تو نفع کے لیے۔ ان چیزوں میں جب نفع نظر آتا ہے تو پھر کوئی رکاوٹ انسان کے لیے رکاوٹ نہیں رہتی اور انسان اس نفع تک رسائی کے لیے ہر ممکن قربانی دینے

کو تیار ہوتا ہے کہ یہ منافع جن کے لیے آج انسان سرگرداں اور پریشان ہے وہ سب موہوم اور عارضی ہیں اوران میں سے ہر نفع کے ساتھ کچھ نہ کچھ خطرات ضرور لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً

۱) تجارت تیار ہونے کے بعد ضائع ہو جائے۔

۲) راستہ سے ڈاکو لوٹ کر لے جائیں۔

۳) مال بردار جہاز غرق ہو جائے۔

۴) بازار میں مال کی قیمت گھٹ جائے وغیرہ وغیرہ۔

مگر افسوس ہے کہ آج پوری انسانیت ان ہی وقتی عارضی منافع کے حصول میں ہمہ تن مشغول ہے۔ دوسری طرف اللہ رب العالمین اپنے بندوں کو خود اپنی صفات سے ایسی تجارت کرنے کی پیش کش فرماتا ہے جس میں کسی طرف کے بھی نقصان کا ذرہ برابر بھی شائبہ نہیں ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ خریدار ہے اوراس کے بندے مطلوب اشیاء کو سپلائی کرنے والے ہیں۔ اور اس تجارت کا تعلق روپیہ یا دنیوی سازو سامان سے نہیں بلکہ ایک طرف اعمالِ صالحہ ہیں اوردوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ان کی قیمت جنت کی صورت میں مقرر فرمائی ہے یہی وہ تجارت ہے جس میں نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ وہم وتصور سے بھی زیادہ نفع ہے جیسا کہ ذیل کی آیات سے

بخوبی معلوم ہوتا ہے۔

۱) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ ○ لِیُوَفِّیَھُمْ اُجُوْرَھُمْ وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ اِنَّہٗ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ "بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور نماز قائم رکھتے اور ہمارے دیئے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں پوشیدہ اور ظاہر وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں ہرگز نقصان نہیں۔" (پ۲۲، الفاطر،۲۹۔۳۰)﴿

۲) ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ "بے شک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لیے ہیں اس بدلے پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔" (پ۱۱، توبہ،۱۱۱)﴿

۳) ﴿وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا "اور جو کچھ بھلے کام کرے گا مرد ہو یا عورت اور ہو مسلمان تو وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے اور اُنہیں

تِل بھر نقصان نہ دیا جائے گا۔" پ۵، النساء،۱۲۴)﴾

۴) ﴿بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ "اے ایمان والو! کیا میں بتادوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے، ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔" (پ ۲۸، الصف،۱۰ تا ۱۲)﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ولایت کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ''یادرکھو جولوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے اُن پر نہ وہ غمگین ہوں گے'' (پ۱۱، یونس،۶۲) اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور اللہ دے ڈرتے رہے۔''

اس آیت مبارکہ میں ولایت کا مدار دو چیزوں پر فرمایا ہے۔ (۱) ایمان (۲) تقویٰ۔ سو جس درجہ کا ایمان وتقویٰ حاصل ہو اسی مرتبہ کی ولایت حاصل ہوگی۔ اگر ادنیٰ درجہ کا ایمان وتقویٰ ہوگا تو ولایت بھی ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔ جو ہر مومن کو حاصل ہے۔ اور اگر ایمان وتقویٰ درمیانی درجہ کا ہوگا تو ولایت بھی درمیانی ہوگی اور اگر ایمان اعلیٰ درجہ ہوگا تو ولایت بھی اعلیٰ ہوگی اس ولایت اعلیٰ کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔

۱)۔۔۔۔۔ایمانِ کامل ۲)۔۔۔۔۔تقویٰ کامل

اور یہ دونوں چیزیں بغیر اصلاح قلب کے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ ایمان کا محل قلب ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ "اور ابھی نہیں داخل ہوا ایمان تمہارے دلوں میں۔" (پ۲۶، الحجرات، ۱۶)﴾ اور اسی طرح تقویٰ کا محل بھی قلب ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿"التقویٰ ھٰھنا واشار الی الصدر" (رواہ مسلم)﴾ لہٰذا اصلاح قلب ضروری ہوا اور اصلاح قلب کے لیے چار شرطیں ہیں۔

○ اول: یہ کہ انسان باطنی اچھی خصلتیں اپنائے۔ جیسے اللہ و رسول کی محبت اور صبر۔ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ۔

﴿اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ "اُس سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی۔" (پ۲، البقرہ، ۱۶۵)﴾

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا "اے ایمان والو صبر کرو۔" (پ۴، ال عمران، ۲۰۰)﴾

○ دوم: یہ ہے کہ تمام بری خصلتیں اپنے اندر سے نکالے جیسے حسد، تکبر اور بغض۔ ﴿لَاتَحَاسِدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَکُوْنُوْا

عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا ''حسد نہ کرو اور بغض نہ رکھو اور ہو جاؤ اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی۔''﴾

○ سوم: یہ کہ اعمالِ حسنہ ظاہر کی پابندی کی جائے جیسا کہ حکم:

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ''اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔'' (پ۱، البقرۃ)﴾

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے تم سے اگلوں پر تاکہ تم پرہیز گار ہو جاؤ۔'' (پ۲، البقرۃ)﴾

﴿وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ ''اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس کے گھر کا۔'' (پ٦، ال عمران، ۹۷)﴾

○ چہارم: یہ کہ تمام اعمالِ سیئہ ظاہرہ سے بچے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ ''وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا ''اور پاس نہ جاؤ زنا کے۔ (پ۱۵، بنی اسرائیل،۳۲)﴾

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ ''اور نہ قتل کرو اس جان کو جس کو حرام کیا ہے اللہ نے۔ (پ۸، الانعام،

﴿۱۵۲﴾

ان چار شرائط کے بعد ایمانِ کامل اور تقویٰ کامل نصیب ہوگا اور ولایت کاملہ ملے گی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اعلان ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا "بے شک مراد و پہنچا جس نے اسے ستھرا کیا۔" (پ۳۰، الشمس)﴾

اور جو ایسے نہ ہوں ان کے لیے اعلان ہے:

﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا "اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔" (پ۳۰، الشمس)﴾

اب ہمارے فرائض یہ ہیں اول ایمان کامل...... دوم اعمالِ صالحہ...... سوم گناہوں سے بچنا...... چہارم غیر اللہ کو دِل سے نکالنا۔

(۱) ایمان اس قدر کامل ہو کہ دیکھنے سے اس میں فرق نہ آوے۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر میں جنت و دوزخ کو آنکھوں سے دیکھ لوں تو میرے یقین میں ذرہ برابر فرق نہ آئے گا کیونکہ دونوں کے وجود کا یقین جو آنا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے آچکا ہے دیکھنے سے اس میں فرق نہ آئے گا۔ اور جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ "میں ایمان کے بدلے جنت نہیں لوں گا کیونکہ میرا ایمان جنت سے قیمتی ہے بلکہ میں تو ایمان کے بدلے خدا کی رضاء

اور اللہ کا دیدار طلب کروں گا۔‘‘

(۲) اعمالِ صالحہ اس درجے کے ہوں جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر شریعت اجازت دیتی تو میں چمڑی ادھیڑ کر سجدہ کرتا بلکہ ہڈی توڑ کر مغز (گودہ) زمین پر رکھتا اور طاقت میں یہ بات ہوتی کہ ساتویں زمین پر سجدہ کروں تو ضرور کر لیتا اور ساتھ فرماتے کہ ’’عمر کا جسم اگر بوٹی بوٹی ہو جائے پھر جلایا جائے تو میرے جسم کی راکھ بھی خدا تعالیٰ کے روبرو سجدہ ریز ہو گی۔‘‘

(۳) اعمالِ سیئہ سے اتنا اجتناب کریں جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب سے میں نے کلمہ پڑھا ہے میں نے بائیں کاندھے کے فرشتے کو قلم اُٹھانے کی نوبت نہیں آنے دی، فرشتے میرے نامۂ اعمال میں کھوٹ تو نکالیں اور اللہ تعالیٰ میرے دِل میں سیاہی تو دیکھیں۔ نہ میرے نامۂ اعمال میں کھوٹ ہے اور نہ دل میں سیاہی ہے۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ گناہوں سے بچ بچ کر اور نیکیاں کر کے میرا گوشت گل چکا ہے اور خون خشک ہو چکا ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس روم کے بادشاہ نے شراب اور سور کا گوشت اور فاحشہ عورت بھیجی۔ تین دن بعد گوشت بھی سالم پڑا تھا اور شراب بھی اور عورت نے جو رپورٹ دی وہ یہ تھی: ﴿اِنَّکَ

بَعَثْتَنِیْ اِلَی الْحَجَرِ لَا یَسْمَعُ وَلَا یَنْظُرَ " آپ نے مجھے ایک پتھر کی طرف بھیجا ہے جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے۔'' ﴾ ایسی ہستیوں پر اللہ کی کروڑ کروڑ رحمتیں ہوں۔ (آمین)

(۴) غیر اللہ اس طرح دِل سے نکلے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو مخاطب کر کے کہا تھا: ﴿وَاللّٰہِ اِنَّکَ لَحَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ لَوْ لَا رَاَیْتُ رَسُوْلُ اللّٰہِ یقبلک مَا قُبِّلْتُکَ " تو ایک پتھر ہے نہ تو نفع دے سکتا ہے اور نہ نقصان اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چومتے نہ دیکھتا تو میں بھی تمہیں نہ چومتا۔'' ﴾

خلاصہ یہ ہوا کہ ادنیٰ ایمان یہ ہے کہ انسان کلمہ توحید پڑھے اور کفر سے پرہیز کرے یہ ادنیٰ ایمان ہے اور ادنیٰ درجہ کا تقویٰ ہے۔ درمیانی ایمان یہ ہے کہ انسان گناہوں سے پرہیز کرے۔ اعلیٰ درجہ کا ایمان یہ ہے کہ انسان تمام نیک کام بھی کرے تمام گناہ بھی چھوڑے اور غیر اللہ کو دل سے نکال دے اور اس بات کا اعلان کرے۔ ﴿قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِکَ الْخَیْرُ ط اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ o" تو کہہ یا اللہ مالک سلطنت کے تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت چھین

لیوے جس سے چاہے اور عزت دے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے تیرے ہاتھ ہے سب خوبی بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"
(پ۳، آل عمران، ۲۶) ﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿خدائی صنعت کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ''بے شک ہم نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا۔'' (پ ۳۰، سورۃ التین، ۴)

علامہ ابن قیم الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ پاک نے حضرت آدم کو جس مٹی اور پانی سے بنایا تھا اس مٹی اور پانی کی کل قیمت ستر (۷۰) روپے تھی مگر اسی ستر روپے کے سامان سے اللہ تعالیٰ نے ایسا انمول انسان بنایا جو اتنا قیمتی ہے کہ سکہ میں اس کی قیمت مقرر نہیں کی جا سکتی حتی کہ ستر کھرب روپے بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ انسان کے انتہائی قیمتی ہونے کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کا کوئی عضو ضائع ہو جائے، انسان کا ایک ہاتھ کٹ کر جدا ہو جائے تو اربوں ڈالر ادا کر کے بھی دوبارہ ویسا ہاتھ اس کو تا آخر نہیں مل سکتا۔ انسان کی اگر آنکھ بے نور ہو جائے تو ساری دنیا کی دولت بھی اس کو وہ آنکھ نہیں دے سکتی جس سے دوبارہ دیکھنے

لگے، انسان کی اگر زبان جاتی رہے تو کوئی بھی قیمت ادا کر کے وہ بازار سے ایسی چیز نہیں پا سکتا جس سے وہ بولے۔ اللہ پاک بے شعور مادے سے باشعور مخلوق پیدا فرماتا ہے کسی جادوگر کی لاٹھی سے اگر آواز نکلے تو سارے لوگ حیران رہ جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ہمیشہ بے جان چیزوں سے جاندار باشعور بولنے والے پیدا فرماتا ہے مگر کسی کو حیرت وعبرت حاصل نہیں ہوتی۔

اگر انسان کی بنی ہوئی مشینوں سے انسان کی پہچان ہوتی ہے تو انسان سے خدا تعالیٰ کی پہچان کیوں نہیں ہوتی؟ انسان بھی تو خدا تعالیٰ کے ہاتھ کی بنی ہوئی مشین ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی صنعت کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ ہم ٹینک کے مقابلہ میں ٹینک...... جہاز کے مقابلہ میں جہاز ...... اورانجن کے مقابلہ میں انجن بنا سکتے ہیں کیونکہ یہ انسانی صنعتیں ہیں...... مگر چیونٹی کے مقابلہ میں چیونٹی نہیں بنا سکتے کیونکہ چیونٹی خدائی صنعت ہے۔ بلب کے مقابلہ میں بلب بنا سکتے ہیں ...... مگر جگنو کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خدائی صنعت ہے۔

جب خدا تعالیٰ نے ہم کو بہترین شکل میں بنایا ہے تو ہماری آنکھ کی سب سے بڑی عزت اس کے کلام کو دیکھنا ہے۔ ہمارے ہاتھ کا فخر اس کے کلام کو چھونا ہے۔ ہمارے سر کی سب سے بڑی

بلندی اس کے دَر پر جھکنا ہے۔

مگر ہمارا حال یہ ہے کہ اگر کوئی ہمارے سامنے ہمارے لڑکے کا ذکر کرے تو ہمارے پاس بیٹے کی تعریف کے لیے بے پناہ الفاظ ہوتے ہیں...... لیکن ہمارے سامنے کوئی اللہ کی تعریف کرے تو ہمارے پاس خدائی تعریف کے لیے ایک لفظ بھی نہیں ہوتا۔ اگر مجلس میں ہمارے والد کا تذکرہ ہو تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کیونکہ لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ یہ بڑے باپ کی اولاد ہے...... لیکن اگر ہمارے سامنے خدا تعالیٰ کی بڑائی بیان ہو تو ہمیں ذرا بھی خوشی محسوس نہیں ہوتی کہ ہم بڑے خدا کے بندے ہیں۔ اور اگر کوئی ہمارے لیڈر کا نام عزت سے لے تو ہم پھولے نہیں سماتے...... مگر خدا کی تعریف سن کر ہمیں جنبش بھی نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ کی عظمت سے کتنی غفلت کی بات ہے۔

مومن کی نشانی یہ ہے کہ مخلوق کے سامنے سخی ہو۔ خدا تعالیٰ کے سامنے ڈرنے والا ہو اور حق کے سامنے جھکنے والا ہو۔ ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ○ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ○ "تو جس نے (اللہ کے راستے میں مال) دیا اور پرہیز گاری کی اور نیک بات کو سچ جانا، تو بہت جلد ہم اُسے آسانی مہیا کر

دیں گے۔" (پ۳۰، اللیل)﴾

کافر کی نشانی یہ ہے کہ وہ مخلوق کے سامنے بخیل بنا رہے، خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں متکبر بنا رہے اور حق کے مقابلہ میں نا جھکنے والا رہے۔ ﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ۝ "اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ بنا، اور سب سے اچھی بات کو جھٹلایا، تو بہت جلد ہم اُسے دشواری مہیا کر دیں گے۔"﴾

جب اللہ تعالیٰ ہم پر سب سے زیادہ مہربان ہے تو اس کے تمام احکام ہمارے حق میں نہایت مفید ہوں گے اگرچہ ہم ان احکام کو بھاری سمجھیں۔ ان احکامات کی مثال ایسی ہے کہ حکومت جابجا اسپیڈ بریکر بناتی ہے تاکہ لوگ تیز رفتاری کی وجہ سے نقصان سے دوچار نہ ہوں اور تباہ و برباد نہ ہوں یہ بریکر سڑک کو محفوظ بنانے کا طریقہ ہے اسی طرح احکامِ شرعیہ خداوندی بریکر ہیں تاکہ ہمیں دنیاوی تیز رفتاری سے روکیں اور دنیاوی و اخروی طور تباہ و برباد نہ ہوں، مثلاً (۱) اذان اس لیے دی جاتی ہے کہ ہماری کاروباری رفتار رُک جائے اور نماز کے لیے وقفہ کریں۔ (۲) جب مال بڑھانا شروع ہو جائے تو زکوٰۃ مقرر ہو جاتی ہے تاکہ مال کی رفتار حد بڑھ نہ جائے۔ (۳) جب کھانے

پینے کا سلسلہ تیز رفتاری اختیار کرتا ہے تو رمضان کے روزے مقرر کر دیئے گئے ہیں تا کہ کھانے کی رفتار حد سے متجاوز نہ ہو۔ (۴) جب رشتہ داریاں حد سے بڑھنے لگ جائیں تو اس رفتار کو سست کرنے کے لیے حج کا تقرر ہوا تا کہ رشتوں کا تعلق کم ہو جائے۔ (۵) جب کپڑوں کی بہتات شروع ہو جاتی ہے تو احرام باندھنے کا حکم جاری ہوا۔ (۶) جب خواہشات کا سلسلہ حدود سے تجاوز کرنے لگتا ہے تو قربانی اس کا سد باب اور روک تھام کر دیتی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿روزے کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

"من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجة فی ان یدع طعامہ وشرابہ" (الحدیث)

روزہ کے کچھ فضائل ہیں، کچھ آداب ہیں اور کچھ حقوق ہیں۔ فضائل میں سے منجملہ یہ ہے کہ (۱) اس ماہ مبارک میں مومن کا رزق بڑھتا ہے۔ (۲) سال بھر کے صغائر (چھوٹے گناہ) معاف ہو جاتے ہیں۔ (۳) رمضان کے مہینہ میں قبور سے عذاب اٹھایا جاتا ہے۔ (۴) جو شخص اس مہینہ میں وفات پا جائے اس کا حساب نہیں ہوتا۔ (۵) روزہ کا ثواب بے حساب ملتا ہے۔ ﴿**"کل عمل ابن آدم یضاعف عشرة اضعاف الی سبعة مائة اضعاف الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ"** (مشکوٰۃ)﴾
روزے کے آداب میں سے یہ ہے کہ سحری اورافطاری کا اہتمام کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر فضائل ہوں یا آداب ان دونوں کے بغیر

بھی روزہ ہو جاتا ہے کیونکہ فضائل کا تعلق علم سے ہے اور اگر کسی کو فضائل رمضان کا علم نہ ہو یا کوئی آداب کا اہتمام نہ کرے تو روزہ اس کا بھی ہو جاتا ہے۔

روزے کے حقوق جن کے بغیر روزہ ادا نہیں ہوتا یا کامل نہیں ہوتا یہ ہے: (۱) مرد نظر بد سے پرہیز کرے۔ (۲) خواتین بد زبانی سے پرہیز کریں۔ (۳) ہر بالغ تمام گناہوں سے پرہیز کرے۔ نہ بد دیکھے، نہ بد سنے، نہ بد بولے، نہ برا کرے، نہ حرام کھائے۔ (۴) تراویح اہتمام سے پڑھے، قرآن سنجیدگی اور وقار سے سنے۔ (۵) نماز باجماعت اور تلاوتِ قرآن کا اہتمام کرے۔ (۶) جھوٹ نہ بولے۔ (۷) غیبت نہ کرے۔ بس اس حدیث کی فکر دامن گیر رہے۔ ''من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة فی ان یدع طعامه وشرابه''

روزہ ایک نور ہے کیونکہ روزہ نہ کھانے، نہ پینے اور خواہشات پوری نہ کرنے کا نام ہے اور یہ تمام صفات ملائکۃ اللہ کی ہیں اور فرشتے نورانی ہیں اور گناہ ظلمت ہے جیسے حدیث پاک میں آیا ہے کہ انسان جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ لگ جاتا ہے، اگر توبہ کر لے تو وہ دھبہ دھویا جاتا اور اگر توبہ نہ

کرے اور دوبارہ گناہ کا ارتکاب کرے تو دوسرا سیاہ دھبہ لگ جاتا ہے حتی کہ گناہ کرتے کرتے دل سیاہ دھبوں کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ "کوئی نہیں بلکہ ان کے دِلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے ان کی کمائیوں نے۔" (پ۳۰، المطففین)﴾

نور اور ظلمت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے پس اگر روزے کا نور ہو تو گناہ کی ظلمت کیسی؟ اور اگر گناہ کی ظلمت ہو تو روزہ کا نور کیسا؟ بلکہ نور ظلمت کو ختم کر سکتا ہے۔ بلب جلتے ہی ظلمت ختم ہو جاتی ہے مگر ظلمت نور کو ختم نہیں کر سکتی بلکہ سبب کے پردے میں نور کو مستور کرتی ہے۔ جیسے چراغ کے اوپر کوئی چیز رکھ کر اسے ڈھانپ دیں تو ڈھانپنے والی چیز کے سبب ظلمت اوپر آجاتی ہے مگر نور (روشنی) کو ختم نہیں کر سکتی بلکہ مستور بنا دیتی ہے۔ تو ہم گناہ کی کمزور ظلمت سے روزے جیسے طاقت ور نور کو کیوں چھپائیں۔

لہٰذا ضروری ہوا کہ روزہ نہ صرف ہمارے پیٹ کا ہو...... بلکہ آنکھ کا بھی ہو...... کان کا بھی ہو...... زبان کا بھی ہو...... اور ہاتھ پیر کا بھی ہو۔ تا کہ تمام اعضاء میں نور ہی نور ہو جیسا کہ ایک مکان کے دس کمرے ہوں اور دسوں کے دس میں لالٹین روشن ہو تو اُسی

طرح جسم بھی ایک مکان ہے اور اعضاء بمنزلہ کمرے کے ہیں تو جب تمام اعضاء کا روزہ ہوگا تو تمام اعضاء میں نور ہوگا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

......☆......☆......☆......☆......

تکبر سے بچنے کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔'' (پ ۱، البقرۃ ۳۴)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کے آگے جھکے مگر شیطان آدم کے سامنے نہ جھکا بلکہ کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ ''اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ'' پھر میں کمتر کے آگے کیوں جھکوں۔ اس کے مقابلے میں دوسرا کردار فرشتوں کا تھا جو حکم ملتے ہی فوراً آدم کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ آدم کی پیدائش کے وقت مذکورہ واقعہ پیش آنا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ یہی معرکہ تمام انسانوں کے ساتھ پیش آنا ہے ہر بیٹے کے سامنے باپ آدم کی حیثیت رکھتا ہے ہر چھوٹے بھائی کے سامنے بڑا بھائی آدم ہے۔ ہر بیوی کے سامنے شوہر آدم ہے۔

چنانچہ جو بیٹا باپ کے سامنے نہ جھکے...... جو چھوٹا بھائی بڑے کے سامنے نہ جھکے...... جو بیوی شوہر کا احترام نہیں کرتی ......تو وہ اس وقت کا ابلیس ہے اور ان میں سے جو بھی اپنی بڑائی کا بت پاش پاش کریگا اور توڑ دے گا، جو بڑے کے مقابلہ میں چھوٹا پن اختیار کرے گا، جو بڑوں کے مقابلہ میں احساس برتری ترک کرے گا، جو بھی اپنی عظمت کا قلعہ ڈھائے گا وہ فرشتوں کا ہم نشین ہو گا بصورت دیگر وہ شخص، ابلیس کا جانشین ہو گا۔

پھر ابلیس کے جانشینوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی سطحی اور اوپری طور پر کسی دینی خرابی میں مبتلا ہو مگر اس کا دل و دماغ اور روح ساتھ نہ دے تو اس کے متعلق اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائیں گے۔ مگر جن کے گناہوں نے جسم سے لے کر روح تک احاطہ کر لیا ہو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی نہیں۔
ایک برائی وہ ہے کہ جب آدمی اس کا ارتکاب کرے تو اس کا دل اس کا ساتھ نہ دے اس کو یہ احساس ستاتا رہے کہ وہ گناہ میں ملوث ہے۔ اس کو اپنے اس فعل کی بنا پر خود سے نفرت ہو جائے تو شرمندہ ہو کر معافی چاہے اور شیطان سے پناہ مانگتا ہو اللہ کی طرف دوڑ پڑے ایسے آدمی کی اندرونی حالت اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا

گناہ اوپری گناہ تھا وہ اس کی روح کا گناہ نہ تھا۔ ایسے آدمی کی برائی کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے اندرونی جسم کا نظام تو صحت مند ہو البتہ اس کے جسم پر کسی وجہ سے گندگی لگ گئی ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے تزکیہ کا وعدہ ہے اللہ ان کو پاک فرمادے گا۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کی برائی ان کے رگ و پے میں پیوست ہوگئی ہو۔ ان کے اعضاء جو کچھ کریں وہ ان کے قلب و دماغ کا سوچا سمجھا منصوبہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگ تزکیۂ خداوندی سے محروم واصل جہنم ہوں گے۔ اس قسم کے لوگوں کو برائی، اچھائی نظر آتی ہے اور اچھائی، برائی نظر آتی ہے جو ناقابل معافی ہے۔ حضرت حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ کا گناہ اس لیے معاف ہوگیا کہ ان کا دِل اس گناہ میں شریک نہ تھا بلکہ انہوں نے صرف اہل وعیال اور مال بچانے کی خاطر اہل مکہ (جو ان کے حلیف تھے) کو خط لکھا اور اصحابِ تبوک کا گناہ بھی اسی قسم کا تھا اس لیے ان کو بھی معافی مل گئی۔ وعلی ھٰذا القیاس

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿معرفت خدا کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنَ ○ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○

"انجیر کی قسم اور زیتون اور طورِ سینا اور اس امان والے شہر کی، بے شک ہم نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا۔" (پ ۳۰، سورۃ التین ا تا ۴)

دنیا کے اندر جتنی بھی اشیاء ہیں ان میں سے ہر چیز، مال بنانے والی ایک فیکٹری ہے مگر تمام فیکٹریوں میں احسن فیکٹری وہ ہے جس کا نام انسان ہے جیسا کہ آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے مگر اہل ارباب و دانش متحیر ہیں کہ انسان کیسے بہترین فیکٹری ہے چونکہ ہر چیز معمولی خام مال کھاتی ہے مگر بہتر سے بہتر مال بناتی ہے جبکہ انسان عمدہ کھانا کھاتا ہے اور فضلہ بناتا ہے تو یہ کیسے احسن تقویم بنا مثلاً سورج میں گیس بھری جاتی ہے اور وہ اس کو بہترین روشنی بنا دیتا

ہے۔ گائے گھاس کھاتی ہے مگر دودھ بناتی ہے۔ درخت مٹی کھاتا ہے مگر پھل پھول دیتا ہے جبکہ انسان عمدہ غذائیں کھاتا ہے لیکن فضلہ بناتا ہے تو یہ انسان کیوں سب سے احسن بنا؟

اصل بات یہ ہے کہ خورد ونوش (کھانا پینا) انسان کا مقصد نہیں بلکہ یہ انسان کی ضرورت ہے۔ انسان کا مقصد یہ ہے کہ پھول کے حسن و جمال کو دیکھ کر خدائی جمال کی معرفت حاصل کرے۔ پھول کی خوشبو سونگھ کر خدائی خوشبو کی معرفت حاصل کرے۔ سورج کی روشنی دیکھے تو خدائی نور کی معرفت حاصل کرے۔ اپنی کمائی دیکھے اور خدا تعالیٰ کے کھاتے میں ڈالے اوراپنی محنت کا نتیجہ نہ سمجھے۔ کیونکہ مزدور محنت تو زیادہ کرتا ہے مگر کمائی تھوڑی وصول کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ کامیابی صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بدولت ہے نہ کہ محنت سے۔ اور تو اور اپنی ناکامی دیکھے تو اس سے اپنی عاجزی تسلیم کرے کہ میں کتنا کمزور ہوں کہ باوجود نہ چاہنے کے میں بیمار ہوتا ہوں...... بوڑھا ہوتا ہوں...... غریب ہوتا ہوں ......غمزدہ ہوتا ہوں۔

یہی معرفتِ خداوندی وہ مال ہے جو انسان کے علاوہ کسی دوسری فیکٹری میں تیار نہیں ہوتا۔ جب انسان یہ مال بنانا شروع کرتا

ہے تو انسان خدائی فیکٹریوں میں سے سب سے بہتر کارخانہ بنتا ہے
جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

اتفاق کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

"المسلمون کلهم کالجسد الواحد اذا اشتکٰی کله اشتکٰی بعضه واذا اشتکٰی بعضه اشتکٰی کله او کما قال" "تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں اگر جسم کے کسی حصہ میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو تمام جسم درد محسوس کرتا ہے۔" (الحدیث)

فطرت کا قانون خدا تعالیٰ کی سنت اور بقاء عالَم کا راز ایک ہی بات میں ہے کہ سب، ایک کے لیے اور ہر ایک سب کے لیے ہے۔ مثلاً زمین، پانی، ہوا سب کے سب درخت کے لیے اور درخت سب کے لیے ہے۔

دیکھئے! زمین درخت کی جڑ پکڑ لیتی ہے، ہوا اس کی شاخوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور پانی اس کے اندر گھس جاتا ہے تو درخت کی نشو ونما شروع ہو جاتی ہے اور جب آفاقی آفت مثلاً خزاں

سے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں تو ہوائیں موسم بہار لا کر درخت کو سبز کپڑے پہنا دیتی ہیں تو سب نے درخت کی خدمت کی اسی طرح درخت سب کے لیے ہے۔

دیکھئے! درخت کے پھل سب کے لیے ہیں پھول سب کے لیے ہوتے ہیں، سایہ بلاتفریق دوست دشمن سب کے لیے ہے اسی طرح سب انسان ہر ایک کے لیے مفید ہوں اور ہر ایک سب کے لیے مگر یہاں یہ حال ہے کہ باپ بیٹوں کے لیے ہوتا ہے مگر ہر بیٹا باپ کی خدمت نہیں کرتا حالانکہ بقاء عالم کا یہ سبب ہے۔

آپ دیکھیں کہ جسم سب اعضاء کے لیے ہے ہر عضو کو اپنے اندر جگہ دی ہے تب اعضاء زندہ ہیں اگر جسم اپنے سے آنکھ نکال دے تو اندھا ہو جائے، کان اُتار دے بہرہ ہو جائے، زبان کاٹے گونگا ہو جائے۔ اسی طرح ہر ہر عضو سارے جسم کے لیے ہے تب جسم دیکھتا ہے...... سنتا ہے...... چلتا ہے...... بولتا ہے...... بقاء عالم کا سبب فقط یہی ہے کہ سب فرد کے لیے ہوں اور فرد سب کے لیے ہو۔ یعنی کل جزء کے لیے مفید ہو اور جزء کل کے لیے مفید ہو۔ ہمارے ذہنوں میں مال جمع ہونے کا سبب سودی کاروبار ہے صدقہ دینا نہیں، عزت کا سبب تکبر ہے عاجزی نہیں حالاں کہ حدیث میں

اس کا عکس بتایا گیا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: ﴿ ''**مانقصت صدقة من مال الى آخر الحديث**'' ﴾

ہمارا ذہن یہ ہے کہ اچھی خوراک سے صحت ملتی ہے۔ مگر حدیث مبارک میں ﴿ **وَلَا يَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ اِلَّا الْبِرّ** ﴾ نیکی کو صحت کا دارومدار بتایا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عزت شہرت اخبارات کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ مگر حدیث مبارک میں آتا ہے ﴿ **من احب ان يبسط في رزقه و ينسأله في ذكره فليصل الرحم** ﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿ترکِ ہویٰ کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَایه ''بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔'' (پ۲۵، الجاثیہ،۲۳)

جنت کے راستے میں نہ تو آسمان رکاوٹ ہیں، نہ زمین اور نہ ہی پہاڑ بلکہ جنتی راستے کی رکاوٹیں خواہشاتِ نفسانیہ ہیں اور اس کی تین وجوہ ہیں۔

۱۔ ایک یہ ہے کہ خواہشات کی وجہ سے آنکھ آوارہ بنتی ہے تو غلط دیکھنے لگ جاتی ہے، کان آوارہ بنتے ہیں تو غلط سننے لگ جاتے ہیں، زبان آوارہ بنتی ہے تو غلط بولنے لگ جاتی ہے، ہاتھ پیر بھی آوارہ بن کر ظلم کرنے لگ جاتے ہیں اور جب انسان سرتاپا خواہشات سے لبریز آوارہ بنتا ہے تو ایسا انسان پاگل خانے میں جانے کا قابل ہے اور وہ جہنم ہے اور جہنمی ابتداءً جنت جانے کا قابل نہیں۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جنت میں نہ تو بوڑھے جائیں گے اور نہ

بچے بلکہ دونوں کو جوان بنایا جائے گا جبکہ خواہشات کا بندہ نابالغ ہوتا ہے اگرچہ سو سال کا ہو اور نابالغ جنت میں نہیں جائیں گے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جو شخص نفس کی رضاء پر چلتا ہے وہ جھگڑالو ہوتا ہے ہر بات پر دوسروں سے جھگڑتا ہے، زمین پر لڑتا ہے، دکان کے لیے لڑتا ہے اور ظلم کر کے لڑتا ہے اور لڑائی انسان کو جہنم تک پہنچاتی ہے جو لوگ خدا کی رضا کے طلب گار ہوتے ہیں وہ کسی کا حق نہیں دباتے بلکہ وہ اپنا حق بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں لڑائی ناممکن ہے۔

جنگِ اُحد میں پانی ایک زخمی سے دوسرے زخمی کے پاس بھیجا گیا یہاں تک پانی ساتویں آدمی تک منتقل ہوا مگر پینا کسی کو نصیب نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو حوضِ کوثر کا پانی پلایا۔ تو جنت میں جانے کے لیے خواہشات کا ترک لازمی ہوا اور خواہشات چھوڑنے کا سبب خوفِ خدا ہے کیونکہ خوف سے شرارتیں چھوٹ جاتی ہیں۔

آپ نہیں دیکھتے کہ بھرے مجمع کے اندر ڈاکو ڈاکہ نہیں ڈالتا چونکہ اس کو سزا کا خوف ہے۔ بچہ پٹنے کے خوف سے شرارت چھوڑ دیتا ہے۔ ایک آدمی بھری مجلس میں شرارت اس لیے نہیں کرتا کہ

اُسے عزت کا خوف لاحق ہوتا ہے۔

پس خواہشات چھوڑنے کا سبب خوف ہوا اور خوف کا سبب مراقبہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان سونے سے پہلے بستر پر لیٹے یہ سوچے کہ اب آنکھ بند ہوگی اور صبح کھلے گی مگر ایک دن آنکھ ایسی بند ہوگی اور قیامت میں کھلے گی اور یہ بھی مراقبہ کرے کہ قیامت کا دن ہے۔ میزان قائم ہے۔ کوئی سفارش نہیں، کچھ رشوت نہیں چلتی، اللہ کے فضل کے ماسوا کوئی ذریعہ نجات نہیں تو اس وقت تڑپ اٹھے گا، خداتعالیٰ کے آگے گریہ وزاری کر کے ہاتھ جوڑے گا کہ اللہ پاک مجھے معاف فرمادیں پھر صبح کو یہ خیال کرے کہ رات جن گناہوں سے توبہ کر چکا ہوں وہ گناہ آج نہیں کروں گا۔

ہم جو نماز میں سستی اور کوتاہی برتتے ہیں یہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں حالانکہ ایک نماز اربوں روپیوں سے زیادہ قیمتی ہے جس کو ہم چھوڑتے ہیں۔ دیکھئے ہم سے اگر کوئی کہے کہ ایک ارب لے لیں اور نماز کا انکار کردیں تو یقیناً ہم ہرگز نہ مانیں گے۔ معلوم ہوا کہ ایک نماز اربوں سے زیادہ قیمتی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿سکون قلب کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب " جولوگ ایمان لائے اوران کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں، سن لو اللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے۔'' (پ۱۳، سورۃ الرعد)

آج کا دور ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے مگر یہ تمام ترقیاں صرف اشیاء کی ترقیاں اور چیزوں کی حد تک محدود ہیں۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے وہ بدستور غیر ترقی یافتہ حالت میں اوندھا پڑا ہوا ہے۔ انسان پیچھے ہے اور چیزیں آگے۔ چراغ ترقی کر کے بلب بن گیا...... کچے مکان نے ترقی کر کے کوٹھی کی شکل اختیار کر لی...... سواری ترقی کر کے گھوڑے سے جہاز تک پہنچی...... دکان ترقی کر کے مارکیٹ بنی...... فیکٹری ترقی کر کے مِل بنی۔ مگر سب سے بڑی ترقی جس کا انسان خواہش مند ہے وہ قلبی سکون ہے لیکن یہ کسی کو

میسر نہیں اور انسان اس سے تاحال محروم ہے۔

چیزوں کی ترقی نے صرف یہ کیا کہ انسان سے اس کا سکون چھین لیا۔ کاروبار نے سونے نہ دیا...... سواریوں نے بیٹھنے نہ دیا...... موبائل نے نہ کھانے دیا نہ ہگنے دیا (تقاضۂ حاجت)۔ یہاں سامانِ سکون تو ہے...... مگر دل کا چین نہیں، یہاں اسبابِ خوشی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں...... مگر حقیقی خوشی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی وجہ کیا ہے......؟ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے کہ یہ تمام چیزیں روح سے کم قیمت کی ہیں اور کم قیمت چیز سے انسان کو خوشی نہیں ہوتی کیونکہ کمتر حاصل کرنے کے لیے پستی میں جانا پڑتا ہے گرنا پڑتا ہے اور گرنے کو انسان پسند نہیں کرتا۔

رُوح اشرف المخلوقات ہے۔ اس کائنات میں انسان کے اوپر صرف ایک ہی ذات پاک ہے اور وہ خود خالق ہے۔ اسی خالق کا پانا سکونِ قلب کا ذریعہ ہے اور یہی حقیقت قرآن پاک بیان کرتا ہے ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب " جولوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں، سن لو اللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے۔" (پ۱۳، سورۃ الرعد)﴾

خالق کے پانے میں سب کچھ پایا جاتا ہے اور خالق کو پانے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ گناہ کے راستے بند ہوں۔

چشم و بند و لب به بند و گوش و بند
گر نه بینی سر حق برمن بجند

بالٹی میں اگر جگہ جگہ چھید ہوں (کئی سوراخ ہوں) تو سارا سمندر اس میں ڈالیں پانی بہہ جائے گا اور بالٹی کے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔ یہی حال عبادات کا ہے جو غفلت سے ادا کی جائیں اور گناہ ساتھ ساتھ ہوں تو ایسی عبادات سے عابد کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ وہ عبادت ہی نہیں جو حضورِ قلب کے ساتھ نہ ہو...... ہوا ہو اور آکسیجن نہ ملے وہ ہوا ہی کیا......؟ پانی پیئے اور پیاس نہ بجھے وہ پانی ہی نہیں...... غذا ہو اور قوت نہ ہو وہ غذا ہی کیا...... پھول ہو اور خوشبو نہ ہو...... سورج ہو اور روشنی نہ ہو...... وہ پھول اور سورج کس کام کا، اسی طرح جب عبادت ہو اور وہ اندر کو متاثر نہ کرے تو وہ عبادت کہلانے کی مستحق نہیں۔

حضورِ قلبی کے بغیر عبادت ایسی ہے جیسے پتھر پر پانی ڈالا جائے کہ پانی ڈالنے سے پتھر چاروں طرف سے تو ضرور بھیگ جاتا ہیں مگر پتھر کا اندرونی حصہ پانی سے نا آشنا ہوتا ہے۔ جس آدمی کی

عبادتیں اس کے اندر ہلچل مچانے میں بے اثر ہوں وہ معاشرہ میں خاک انقلاب پیدا کریں گی۔ جس آدمی کی عبادتیں اس کا دِل نہ ہلائے غیروں پر خاک اثر کریں گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ریاضت کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

ایک چیز میں کشش جاذبیت کب پیدا ہوتی ہے؟ چیز اس قابل کب پیدا ہوتی ہے کہ دوسری چیز کو اپنی طرف کھینچے تو اس کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ چیز جاندار ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس چیز کو اپنی طرف کھینچے وہ اس کی ہم جنس ہو۔ چناں چہ ایک مردہ دوسرے مردے کو اس لیے نہیں کھینچتا کہ دونوں بے جان ہیں، مرغی اور گائے ایک دوسرے کی طرف رغبت اس لیے نہیں کرتے کہ دونوں ہم جنس نہیں۔ اسی طرح ہم بھی اگر ایمان والی جان سے محروم ہوں گے تو ہمارے اندر قرآن و دین کی طرف کشش نہیں ہوگی اور اگر ہم اچھے اخلاق سے محروم ہوں گے تو ہمارے اندر خدا تعالیٰ کی طرف کشش نہیں ہوگی۔

ہم جنس ہونا اچھی صفات میں اتحاد کا نام ہے۔ سگ اصحابِ کہف اوصاف کے اعتبار سے انسان بنا۔

سگ اصحاب کھف روزے چند
پئے نیکاں گرفت مردم شد

کنعان اخلاق سے محرومی کے سبب باپ سے ناجنس بنا۔

پسر نوح با بدان نشست
خاندان نبوتش گم کرد

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اوصاف کے اعتبار سے فرشتہ بنے تو فرشتوں نے اٹھا لیا۔ ابلیس فرشتوں میں رہتے ہوئے اخلاق سے عاری ہونے کی وجہ سے فرشتوں سے نکالا گیا۔ ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○ ''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔'' (پ ۱، البقرۃ)﴾

ہمارا فرض ہے کہ جنتی پھولوں جیسے اخلاق اپنائیں...... تاکہ جنت کے قابل بن جائیں۔ نبوت کے اخلاق پیدا کریں ...... تاکہ انبیاء علیہم السلام کے خادمین کے زمرہ میں داخل ہو جائیں۔ خدائی مرضیات کا مظہر بن جائیں...... تاکہ خدا تعالیٰ تک پہنچ جائیں۔ اکیلی دنیا کچھ بھی نہیں۔ ہر چیز اپنے جوڑے سے مکمل ہوتی ہے اور دنیا کی جوڑی

آخرت ہے۔ جیسے ایک جوتا دوسرے کے بغیر نا تمام ہے۔ پاجامہ...... قمیص کے بغیر، آنکھ...... آنکھ کے بغیر، پاؤں...... پاؤں کے بغیر، ہاتھ...... ہاتھ کے بغیر ناتمام ہیں۔ اسی طرح دنیا آخرت کے بغیر ناتمام ہے۔

ایک وقت آنے والا ہے۔ کھانا ہوگا...... مگر اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ کھا کر بھوک مٹائیں۔ پانی ہوگا...... مگر پینے کی طاقت نہیں ہو گی کہ پیاس بجھے۔ گرم کپڑے ہوں گے...... مگر سردی دُور کرنے کے لیے پہننے کی طاقت نہیں ہوگی۔ گرمی ستائے گی...... مگر ٹھنڈ کے لیے سایہ نہ ہوگا۔ پاؤں ہوں گے...... مگر چلنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنْ

......☆......☆......☆......☆......

﴿دعوت حق کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَق ''اُسی کا پکارنا سچ ہے۔'' (پ۱۳، الرعد،۱۶)

آج کل ہر آدمی دعوت حق کا نام لیتا ہے مگر دعوت حق ابھی تک وجود میں نہیں آئی اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ اس کی قیمت ادانہیں کرنا چاہتے۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور دعوتِ حق کی بھی ایک قیمت ہے جب تک کہ وہ قیمت ادا نہ کی جائے دعوت حق وجود میں نہیں آسکتی۔ حق کی دعوت کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ غیر حق کو عملاً چھوڑ دیا جائے۔ چناں چہ خدا تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کے لیے اٹھنا...... اور انسانوں کی بڑائی میں گم رہنا، آخرت کا داعی بننا...... اوردنیاوی مفادات کے لیے لوگوں سے کش مکش کرنا، اَبدی مسائل کی بات کرنا ...... اوراسی کے ساتھ وقتی وعارضی مسائل میں اُلجھے رہنا۔ یہ سب تضاد کی باتیں ہیں اور جو لوگ اپنے اندر تضاد لیے ہوئے ہوں وہ کبھی حق کے داعی نہیں بن

سکتے۔اس قسم کا ہر واقعہ بتاتا ہے کہ لوگ داعی حق کا ٹائٹل لینے کے لیے تو دوڑ پڑے ہیں مگر وہ اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار نہیں۔لوگوں کو اپنی مفروض شخصیتیں اتنی زیادہ محبوب ہیں کہ ان پر ادنیٰ تنقید سننا بھی گوارا نہیں، لوگوں کو اپنے دنیاوی مفادات اور مصلحتوں سے اتنی دلچسپی ہے کہ وہ ان کو کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتے۔

جو قومیں اسلام کے پیغامِ رحمت کی مخاطب ہیں ایسے لوگ ان اقوام کو قومی و مادی لڑائی میں ملوث کر کے اسلام سے بدکائے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی چیزوں کے ساتھ حق کی دعوت کا نام لینا صرف یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی دعوتِ حق کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں۔حق کی دعوت اَبدی صداقتوں کی دعوت ہے۔حق کی پکار خدا اورآخرت کی پکار ہے۔ یہ ایک نہایت نازک کام ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا اَمر جمع نہیں ہوسکتا۔

داعی حق کو ہر واقعہ میں آخرت کی تصویر دکھائی دیتی ہے وہ گرمی کی تپش دیکھتا ہے......تو اس میں اسے نارِ جہنم کی شدت دکھائی دیتی ہے۔اسے معاشی تنگی کا سامنا ہوتا ہے......تو وہ اسے آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ وہ لوگوں کوظلم کے خلاف چیختے چلاتے

دیکھتا ہے......تو کہتا ہے کہ اے لوگو! اس دن کو یاد کرو جب تمہارے پاس زبان نہ ہوگی کہ تم بولو اور پانی کا ایک گلاس بھی نہ ہوگا جس سے تم اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کرو۔

ایک مسئلہ آدمی کے ذہن پر بہت زیادہ چھایا ہوا ہو تو دوسرے تمام مسائل اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں وہ اپنے مخصوص مسئلہ کا ایسا مبلغ بن جاتا ہے کہ وہی ساری دنیا کا مسئلہ ہو چکا ہو۔ اس کے سوا کسی کا وجود نہیں۔ ''کارل مارکس'' کے ذہن پر معاش کا مسئلہ چھا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مذہب و اخلاق ہر چیز کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ ہندوستان میں اکثر لیڈروں پر آزادی وطن کا خیال چھا گیا نتیجتاً دوسری تمام چیزیں ان کے ہاں سے درخانہ غفلت چلی گئیں۔ یہی معاملہ ایک اور صورت میں حق کے داعی کا ہے۔ داعی حق کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت آخرت کی ہوتی ہے وہ جہنم سے بہت زیادہ ڈرتا ہے اور جنت کا سب سے زیادہ مشتاق ہوتا ہے۔ اس کا فطری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسرے تمام مسائل اس کی نظر میں کالعدم ہو جاتے ہیں جیسے ان کا کوئی وجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں صرف دو ہی پکاریں ہیں۔ ایک دنیا

کی پکار...... دوسری آخرت کی پکار۔ آج تمام پکارنے والوں کا یہی حال ہے کہ وہ لوگوں کو دنیا کی طرف بلا رہے ہیں وہ لوگوں کو سیاسی، معاشی اور سماجی خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں آخرت کی طرف پکارنے والے بہت کم ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ کردار کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

قرآن میں ہے کہ ہر انسان اپنے کیے میں پھنسا ہوا ہے: ﴿کُلُّ نَفْسٍ م بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ ''ہر جان اپنی کرنی (اعمال) میں گروی ہے۔'' (پ۲۹، المدثر ۳۰) ﴾ لوگ خود اپنے کیے ہوئے کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا کَسَبُوْا ''یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے کئے پر پکڑے گئے۔'' (پ ۷، الانعام، ۷۰)﴾ قیامت میں لوگوں سے کہا جائے گا کہ چکھو جو تم کماتے تھے: ﴿وَقِیْلَ لِلظّٰلِمِیْنَ ذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْسِبُوْنَ ''اور کہے گا ظالموں کو چکھو جو تم کماتے تھے۔'' (پ۲۳، الزمر، ۲۴)﴾ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ یہ تمہارا اپنا کیا ہے جو تمہاری طرف لوٹایا جائے گا۔ ﴿''انما ھی اعمالکم ترد الیکم''﴾

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی ایک انڈسٹری (کارخانہ) ہے

مومن خدا کی انڈسٹری ہے اور کافر شیطان کی انڈسٹری ہے۔ ہر آدمی اپنی بساط کے مطابق اپنی پیداوار کا ڈھیر لگا رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کے علم کے مطابق آدمی جب اپنے حصے کا کام کر چکا ہوتا ہے تو اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی اگلی زندگی شروع ہوتی ہے جہاں وہ ابدی طور اپنی اگائی ہوئی فصل کے حوالے کر دیا جاتا ہے چناں چہ جس نے کانٹوں کی فصل اگائی تھی وہ اپنے آپ کو کانٹوں میں پھنسا پائے گا اور جس نے پھول اور خوشبو کی فصل اگائی تھی وہ پھول اور خوشبو والے باغات میں ہمیشہ رہے گا۔

انڈسٹری کیا ہے؟ انڈسٹری ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر خام مال ڈالا جائے اور پھر وہ تیار شدہ سامان کی صورت میں برآمد ہو۔ ایک انسان وہ ہے جس کو خدا نے بڑائی دی ......تو اس نے تواضع کی صورت میں ردِعمل پیش کیا۔ اس کا احتساب کیا گیا......تو اس نے بصورت عجز نفسیات قبول کیا۔ اس کے پاس دولت آئی......تو اس نے خدا کے راستے میں اس کا استعمال ڈھونڈا۔ اس کو مواقع ملے ......تو ان مواقع میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس نے لوگوں پر قابو پایا......تو ان کے لیے انصاف اور خیر خواہی کا پیکر بن گیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے خدا کی انڈسٹری اپنے اندر قائم کی

تھی جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوئی وہ ربانی پیکر میں ڈھل کر باہر نکلی۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کی انڈسٹری سے زہر اور انگارے برآمد ہوئے۔ اس کو جب موقع ملا...... اس نے اپنی بڑائی کا جھنڈا بلند کیا۔ اس کے پاس دولت آئی...... تو اس کو اپنے نمود اور دکھلاوے کے لیے خرچ کیا۔ اس نے دوسرے پر غلبہ پایا...... تو اس کی بربادی کے منصوبے بنائے۔ اس کا کسی سے اختلاف ہوا...... تو اس کو اپنے زہریلے کلام اور آتشیں عمل کا مزا چکھایا۔ ایسا آدمی گویا اپنے اندر شیطانی انڈسٹری قائم کیے ہوئے ہے جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوتی ہے وہ زہر، آگ اور بدبو بن کر نکلتی ہے۔ موت کے بعد اس کی یہ پیداوار اسے گھیر لے گی وہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی جہنم میں پائے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿تعمیر زندگی کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اگر آپ جنوری ۲۰۰۴ء میں ہوں تو جنوری ۲۰۰۵ء تک پہنچنے کے لیے آپ کو بارہ مہینے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ زمین اپنے محور پر ۳۶۵ بار گھومے گی اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ آپ کا ایک سال پورا ہو اور آپ تکمیل سال کے مرحلہ تک پہنچ سکیں۔ موجودہ زمانے کے مسلمان بار بار یہ اقدام کرتے ہیں اور بار بار ناکام ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقدام کے مذکورہ تقاضے پورے نہیں کرتے۔ تو جس طرح بارہ مہینے گزرے بغیر انسان جنوری ۲۰۰۴ء سے جنوری ۲۰۰۵ء میں نہیں پہنچ سکتا اسی طرح جو تاریخ کے آغاز میں ہو وہ تاریخ کے اختتام تک کیسے پہنچے گا۔ ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے انسان بننا پڑتا ہے...... پھر مسلمان ...... پھر متقی ......تب انسان ولایت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ انسان بننا یہ ہے کہ مخلوق سے ٹکراؤ چھوڑ دے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿اتق اللہ حیثما کنت واتبع السیئة الحسنة وخالق الناس بخلق حسن (رواہ الترمذی)﴾ ان تین امور میں سے ہر ایک اسلام کا مغز اور خلاصہ ہے۔

(۱) پہلی چیز یہ ہے کہ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے رکھو اور سب سے زیادہ خوف بھی خدا کا ہو۔ خدا تعالیٰ کی عظمت دِل و دماغ میں ایسی چھائی ہوئی ہو کہ ہر وقت...... ہر جگہ...... ہر حالت میں......خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھیں۔

(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ دوسروں کی برائی کے بدلے بھلائی کرو تا کہ برائی کا خاتمہ ہو جائے۔

(۳) تیسری چیز یہ ہے کہ لوگوں سے اچھا سلوک کرو۔

پہلی چیز میں خالق کے حقوق کی حفاظت ہے جبکہ دوسری اور تیسری چیز میں مخلوق کے حقوق کا تحفظ ہے...... اور اسلام ان دو حقوق کا نام ہے۔

دیکھئے چشمے کا پانی جب چلتا ہے تو اگر مقابل بڑی چٹان آجائے تو پانی اس کو چیر کر نہیں بہتا بلکہ رخ پھیر کر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ یہ ہمیں سبق ہے کہ چٹانوں سے ٹکر مت لو بلکہ منہ موڑ

کر دوسرا راستہ اپناؤ۔ انسان بننے کے بعد مسلمان بننا پڑتا ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھ کر ضروریاتِ دین کا اقرار کرے پھر گناہ چھوڑ کر متقی بنے پھر ولایت میں قدم رکھے۔ اگر آپ سڑک کے ایک سرے پر ہوں اور آپ کی منزلِ مقصود دوسرے سرے پر ہو تو آپ کو درمیانی مراحل طے کرنا ہوں گے تب آپ منزل پر پہنچ پائیں گے، اور اگر آپ یہ چاہیں کہ درمیانی منازل طے کیے بغیر منزل پر پہنچ جاؤں تو یہ محض خام خیالی ہو گی۔ اسی طرح ایک شخص ابھی انسان نہیں بنا اور وہ ولایت کا دعوے دار ہے، ابھی علم شروع کیا ہے اور اپنے آپ کو علامہ سمجھتا ہے یہ خام خیالی ہے۔ ایک بچہ جوانی طے کیے بغیر کیسے بڑھاپے میں پہنچ سکتا ہے۔ ایک آدمی درمیانی ''پوڑیاں'' (سیڑھی کے زینے) چڑھے بغیر پہلی پوڑی سے چھت کو کیسے پہنچ سکتا ہے۔ پس انسان بننے کے لیے صبر اور صبر کی ضرورت، بس عفو اور عفو کی ضرورت، حکمت اور حکمت کی ضرورت ہے۔ ٹکراؤ چھوڑنے کی ضرورت ہے۔

دیکھئے! درخت بھی سمجھتا ہے کہ میری بقا عفو و درگزر میں ہے انتقام میں نہیں، اس لیے جب زمین درخت کو مٹی دیتی ہے تو درخت مٹی نہیں برساتا بلکہ درگزر کر کے پھل پھول اور سایہ برساتا

ہے۔ ہم گائے کو صرف گھاس کھلاتے ہیں مگر گائے گھاس نہیں بلکہ دودھ دیتی ہے کیونکہ درخت اور گائے کی زندگی اسی عفو میں مضمر ہے۔ اگر درخت مٹی برسائے اور گائے دودھ نہ دے تو درخت کاٹا جاتا ہے اور گائے ذبح کی جاتی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

......☆......☆......☆......☆......

تقویٰ کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

عن ابی سعید الخدریؓ عن النبی ﷺ قال: مثل المؤمن و مثل الایمان کمثل الفرس فی اخیتہٖ یجول ثم یرجع الٰی اخیتہٖ (رواہ البیھقی) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن کی مثال اور اس کے ایمان کی مثال گھوڑے کی مانند ہے جو رسی میں بندھا ہوا ہو وہ گھومتا ہے پھر اپنے کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے۔''

ایک گھوڑا پانچ میٹر کی رسی میں بندھا ہوا ہو تو اس کی حرکت رسی کی لمبائی کے بقدر ہوگی وہ چاروں طرف گھومے گا مگر پانچ میٹر سے آگے نہ جا سکے گا۔ یہی مثال مومن کی ہے، مومن کا ایمان اس کے لیے حد بندی کا ہم معنٰی بن جاتا ہے وہ اتنا ہی جاتا ہے جتنا اس کا ایمان اسے اجازت دے۔ ایمان کی حد آتے ہی وہ مجبور ہوتا ہے کہ فوراً ٹھہر جائے۔

(۱) اس کا ایمان صرف حلال کمائی کی اجازت دیتا ہے۔ اس لیے وہ حلال کے دائرے میں رہ کر کماتا ہے اور جہاں حرام کا دائرہ شروع ہو وہاں اس کے قدم رُک جاتے ہیں۔

(۲) مومن کی زبان ایمان کی حد تک بولتی ہے۔ ناحق بات کہنے سے اس کی زبان رکی رہتی ہے۔

(۳) مومن کی زبان کے ساتھ اس کی آنکھ بھی ایمان کی حد تک دیکھتی ہے۔

(۴) مومن کے کان ایمان کے دائرے میں سنتے ہیں۔

(۵) مومن ایمان کی حد تک سوچتا ہے مومن مجبور ہوتا ہے کہ وہ صرف جائز دائرہ میں بولے سنے، دیکھے اور کام کرے۔ ایمان کی حد توڑ کر بولنا...... سننا...... دیکھنا...... اور کام کرنا یہ فسق ہے۔ نہیں! ظلم ہے بلکہ کفر ہے۔ اگر اس حد کو توڑنا جائز سمجھے تو اس کے لیے سخت وعیدیں ہیں۔ ﴿ ''وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدُ اللهِ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ '' سو وہی لوگ ہیں نافرمان'' (پ ٦، المائدۃ، ۴۷) ﴾ ﴿ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ''سو وہی لوگ ہیں ظالم'' (پ٦، المائدۃ، ۴۵) ﴾ ﴿ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ''سو وہی لوگ ہیں کافر'' (پ٦، المائدۃ، ۴۴) ﴾ یہ تمام حد بندیاں اگر محفوظ ہوں گی تو

تب ایمان کامل تک پہنچے گا۔

اگر آپ جنوری دو ہزار چار میں ہوں اور چاہیں کہ جنوری دو ہزار پانچ میں پہنچیں تو آپ کو بارہ مہینے تک انتظار کرنا پڑے گا زمین اپنے محور پر تین سو پینسٹھ بار گھومے گی اس کے بعد ممکن ہوگا کہ آپ ایک سال پورا ہو اور آپ تکمیل سال کے مرحلہ تک پہنچ سکیں۔ موجودہ زمانے کے مسلمان بار بار اقدام کرتے ہیں اور بار بار ناکام ہوتے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اقدام کے مذکورہ تقاضے پورے نہیں کرتے۔ ہم ابھی تاریخ کے آغاز میں ہوتے ہیں اپنے کو تاریخ کے اختتام میں دیکھتے ہیں۔ جو شخص راستے کے ابتدائی سرے پر کھڑا ہو وہ درمیانی فاصلہ طے کئے بغیر انتہائی سرے تک نہیں پہنچ سکتا۔

یہ اس دنیا کا عالم گیر قانون ہے مگر ہم اس قانون کو بھولے ہوئے ہیں۔ ہم عملاً پہلے مہینے میں ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چھلانگ لگا کر آخری مہینہ میں جا پہنچیں ہم بنیاد کی تعمیر نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ اپنے خیالی مکان کی بالائی چھت پر کھڑے نظر آئیں۔ تو ترتیب یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے چار کام کریں۔

(۱) ہم ایک با مقصد قوم تیار کریں۔

(۲) ہم قوم کے افراد کو وہ تعلیم دیں جس سے وہ ماضی اور حال کو پہچانیں۔

(۳) ان کے اندر وہ جذبات اور شعور بیدار کریں کہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانیں۔

(۴) ان کے اندر وہ حوصلہ اُبھاریں کہ وہ شخصی مفادات اور وقتی جذبات سے ماوراء ہو کر قربانی دے سکیں۔

اس کے بعد کوئی اقدام کریں جو ہمارے لیے نئی تاریخ رقم کرنے والا ہو۔ اس سے پہلے اقدام کرنا صرف موت کے گڑھے میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہے نہ کہ چمنستانِ زندگی میں داخل ہونے کا باعث۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن

......☆......☆......☆......☆......

﴿رحم کرنے کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا
اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ

''تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر مہربان ہوگا۔''

ہم اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ سے جو چاہتے ہیں پہلے اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ وہی معاملہ اختیار کریں۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم کرے تو پہلے ہم دوسروں پر رحم کریں۔ ﴿''اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ'' تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر مہربان ہوگا۔﴾

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر خدا مہربان ہوگا عرش بریں پر

کیونکہ ﴿''اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُ الرَّحْمٰن'' رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ مہربانی کرتا ہے۔﴾ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری غلطیوں کو معاف کرے تو پہلے ہم دوسروں کی غلطیوں کو معاف کریں۔ ﴿''مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَ اللّٰہ ذُنُوْبَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃَ'' جو

کسی مسلمان کے عیب چھپائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے گناہ چھپائے گا۔﴾

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عزت دے تو پہلے ہم دوسروں کی عزت کریں۔ ﴿مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰه جو اللہ کو راضی کرنے کے لیے عاجزی کرے گا اللہ اس کو بلندی عطا فرمائے گا﴾ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بارِ خلافت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا تو اس وقت یہ عجیب بات ارشاد فرمائی: ﴿"احبك محب وابغضك مبغض" کہ بہت سے آدمی آپ سے محبت کریں گے اور بہت سارے ناگواری کا اظہار فرمائیں گے۔﴾ ہر آدمی مزاج کی مناسبت سے معاملہ کرے گا۔ تو پھر ہما شما کی کیا حیثیت ہے؟ ہم ایسا کیوں سمجھیں کہ سارے لوگ ہماری ہاں میں ہاں ملائیں گے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا مشورہ دشمن سے بھی کریں لیکن وہ جو رائے دے اس کا الٹ کریں۔ جب الٹی چیز کو الٹ دیں تو سیدھی ہو جائے گی چونکہ نفی کی نفی اثبات کا فائدہ دیتی ہے۔

حالات سے متاثر ہونا عیب نہیں لیکن اس قدر متاثر ہونا کہ مخالف پر ظلم کریں اور حدود اللہ توڑ دیں یہ عیب اور گناہ کی بات ہے۔ اپنے قلب و دماغ میں بڑائی کا تصور نہ رکھیں ورنہ آپ جو بھی

نصیحت کی بات کریں گے لوگ کان نہ دھریں گے۔ اپنے آپ کو متواضع بنائیں تاکہ ہر ایک بے تکلف بات اور نصیحت کر سکے۔ بعضوں کو حق بات تسلیم کرنے میں اپنی ناک کٹتی نظر آتی ہے۔ اس لئے ناک اتنی لمبی نہ بنائیں کہ کٹنے کا سوال پیدا ہو۔ اس قانون کا نام مکافات عمل ہے: ﴿ ''کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ'' جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ ﴾ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ گندم بوؤ گے تو گندم کاٹیں گے، کانٹے بوئیں گے تو کانٹے کاٹیں گے۔

مگر یاد رکھیں! عزت کرنے، رحم کرنے اور لوگوں کی غلطیاں معاف کرنے میں دِل پر گراں گذرے گی اور عزت، رحم، معافی ملنے میں راحت ہوگی، لیکن نہ دِل پر شاق گزرنے سے گھبرائیں اور نہ ہی راحت سے اِترائیں۔ اول الذکر بات میں پہاڑوں سے سبق لیں کہ موسم سرما کے اندر برف میں ڈوب جاتے ہیں اور گرمی کے موسم میں سورج کی تمازت سے جل رہے ہوتے ہیں مگر اف تک نہیں کرتے: ﴿اِن الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا﴾ پر عمل کریں۔ اور دوسری بات میں سورج اور پھول سے سبق حاصل کریں۔ سورج باوجود اتنی اونچائی کے ہر وقت رب کے سامنے سر بسجود رہتا ہے اور پھول باوجود اتنے نازک ہونے کے کانٹوں پر صبر

کرتا ہے۔

بعض لوگوں کو آپ سے مناسبت ہوگی اور بعض کو نہیں ہوگی اس میں کوئی حرج نہیں اس لیے کہ کوئی آدمی بھی ایسا نہیں جس سے سبھی لوگ محبت کرتے ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿ کائنات سے سبق لینے کی اہمیت ﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

کائنات خدا تعالیٰ کا آئینہ ہے یہاں خدا اپنی مخلوق کے روپ میں نمایاں ہے آدمی کی فطرت اگر زندہ وصحیح ہوتو اپنے گردو پیش خدا کو پائے گا۔ آپ دیکھئے! جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ ایک آنکھ سے پورے جہاں کو دیکھتا ہے تو کیا اس کا خالق اپنی مخلوق کونہیں دیکھے گا۔ دریاؤں میں جب پانی رواں دواں ہوتا ہے تو بے شور اعلان کرتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک ایسا خالق ہے جو چلتا ہے اور اقدام کرکے آگے بڑھتا ہے اور کوئی اس کو روکنے والانہیں۔ جب ہم سیلاب کونہیں روک سکتے تو اس کے خالق کو کیسے روک سکتے ہیں۔ جنگل کا شیر جب اپنے تئیں کسی کو قابو کرتا ہے تو گویا وہ پیغام دیتا ہے کہ اس کو پیدا کرنے والا ایک ایسا خدا ہے جو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے اور چیزوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب اس جہاں کا خالق دیکھتا بھی ہے، طاقت

ور بھی ہے، پکڑ بھی سکتا ہے تو پھر اتنی برائیاں اور اتنی بغاوتیں جو ہو رہی ہیں تو وہ خالق ایسے ظالموں کو کیوں نہیں پکڑتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دنیا خدا کا مستقل بندوبست نہیں بلکہ صرف امتحانی بندوبست ہے یہ ایک کھیت ہے جس میں مختلف پودوں کو اُگنے کا موقع دے کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا درخت ہے اور کون جھاڑ جھنکا؟ اس کے بعد اچھے درختوں کو ہر قسم کے مواقع فراہم کر کے تمام برے درختوں کو اُکھاڑ دیا جائے گا اور پھر خدائی دنیا، خدا کے معیاری انتظام کے تحت حسن و لذت کی اَبدی بہشت بن جائے گی۔

دنیا میں تین قسم کے آدمی ہیں۔(۱) ایک یہ کہ خوفِ خدا سے عاری ہوں۔ ایسے لوگ خواہ زبان سے اللہ اللہ کرتے ہوں مگر ان کے سینہ میں اللہ کے ڈر کی ذرا بھی رمق نہیں ہوتی، وہ اس طرح رہتے ہیں جیسے شُتر بے مَہار ہوں، جو جی میں آئے کر گزرتے ہیں۔ ان کا مطمع نظر صرف دنیاوی نفع و نقصان ہوتا ہے جس کام میں نفع ہو اس کی طرف لپکتے ہیں اور جس کام میں نقصان کا اندیشہ ہو اس سے رک جاتے ہیں۔ حق کی کوئی وقعت ان کے ہاں نہیں ہوتی۔ کام کرتے وقت وہ یہ نہیں سوچتے کہ اللہ کی مرضی کیا ہے، وہ وہاں جھکتے

ہیں جہاں ان کا نفس جھکنے کے لیے کہے اور وہاں اکڑتے ہیں جہاں ان کا نفس اکڑنے کی ترغیب دے۔

(۲) دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے دلوں میں خوف خدا رہتا ہے مگر تین مقامات پر وہ بھی بے خوف ہو جاتے ہیں۔ پہلا مقام یہ کہ دوست کے حق میں جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور حق کے خلاف ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ دوسرا مقام یہ کہ لالچ کی خاطر خوف خدا نہیں رہتا لہٰذا لالچ میں حق کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں۔ تیسرا مقام یہ کہ عزت اور اَنا کی خاطر حق سے ٹکراتے ہیں۔

(۳) تیسری قسم وہ ہے کہ ﴿وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ "اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے۔" (پ ٦، المائدۃ ۵۴)﴾ ہر حال میں حق کا ساتھ دیتے ہیں خواہ حق دوست کے خلاف کیوں نہ ہو۔ ملکہ نور جہاں نے اپنے شوہر سے ایک شیعہ کے بارے میں سفارش کی تھی مگر بادشاہ نے صاف جواب دیا تھا کہ "جانم دادم ایمان نہ دادم" اور شیعہ کو قرار واقعی سزا دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زِرّہ جب یہودی نے چوری کی تو امیر المومنین نے عدالت میں درخواست دائر کی۔ جب مقررہ تاریخ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو سایہ دار جگہ کھڑے ہوئے۔ اس

کے بعد یہودی آیا مگر جگہ کی تنگی کے باعث اس کے لیے سایہ میں جگہ نہ تھی تو قاضی شریح" (چیف جسٹس) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سایہ سے ہٹنے کا حکم صادر فرمایا اور یہودی کے برابر دھوپ میں کھڑے ہونے کو کہا۔ پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بطورِ گواہ اپنے بیٹے اور غلام کو پیش کیا تو قاضی شریح" نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ نہ تو بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول ہے اور نہ ہی غلام کی گواہی مولیٰ کے حق میں اور عدمِ شہادت کی بناء پر یہودی کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ تب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تلوار نکالی اور فرمایا: اگر تم شریعت کے خلاف میری رعایت کرتے تو اس تلوار سے تیری گردن اڑا دیتا۔ قاضی صاحب نے جواب میں فرمایا: میں نے بھی بستر کے نیچے تلوار اس لیے چھپا کر رکھی تھی کہ اگر امیر المومنین مجھ سے خلافِ شرع توقع رکھیں گے تو میں امیر کو زندہ نہیں جانے دوں گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿حقیقت کی اہمیت﴾

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

انسان کو دکھائی دیتا ہے کہ آنکھ دیکھ رہی ہے اور کان سن رہا ہے اور زبان بول رہی ہے حالانکہ درحقیقت معاملہ ایسا نہیں اور جو حقیقت ہے وہ دکھائی نہیں دیتی اور وہ انسان میں نہ دکھائی دینے والی اصلی طاقت روح کی ہے۔ روح کے بغیر آنکھ ہے ......مگر وہ دیکھتی نہیں، زبان ہے......مگر بولتی نہیں۔ معلوم ہوا جہاں سے محسوس ہو رہا ہے وہ حقیقت نہیں اسی طرح کائنات کی چیزوں کے ٹوٹنے پھوٹنے اور بننے سنورنے کا عمل انسان کو دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی قدرت سے چیزوں کے پردے میں کام بنتے اور بگڑتے ہیں مگر یہ حقیقت اور اصلی طاقت دکھائی نہیں دیتی اس لیے لوگوں نے کائنات کی چیزوں کو حقیقت سمجھ لیا۔ مکڑی کا جالا زندگی کی حفاظت نہیں کر سکتا، لنگڑا مچھر زندگی نہیں اجاڑ سکتا مگر خدا تعالیٰ چاہے تو مکڑی سے جالا بنوا کر محمد رسول اللہ ﷺ کی

حفاظت کر دے اور لنگڑے مچھر کے ذریعہ نمرود کی زندگی اجاڑ دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ میں اور یونس علیہ السلام کی مچھلی کے پیٹ میں اور اسماعیل علیہ السلام کی چھری کے نیچے حفاظت کرے اور فرعون، نمرود، قارون، قومِ عاد، قومِ ثمود اور قیصر و کسریٰ کو ملک و مال اور حفاظتی نعشوں میں اجاڑ دے معلوم ہوا کہ زندگی کے بگڑنے اور بننے کا معیار کائنات کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔

ہر زمانے میں گمراہ لوگوں نے ملک و مال، حکومت اور اکثریت کے گھمنڈ میں نیک لوگوں کو دھمکیاں دی ہیں اور دیتے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ گمراہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ تم ہمارا طور وطریق اختیار کرو ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے لیکن اللہ رب العزت اپنے رسولوں سے وعدہ کرتا ہے کہ یہ گمراہ لوگ تمہیں ملک سے نکالنے کی اسکیمیں بناتے ہیں لیکن ہم ان ظالموں کو دنیا سے ہی نکال دیں گے۔ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَا اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ

”اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دینگے تم کو اپنی زمین سے یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں، تب حکم بھیجا اُن کو اُن کے رب

نے ہم غارت کرینگے ان ظالموں کو۔" (پ۱۳، ابراہیم،۱۳)﴾

اگر لوگوں میں دو باتیں پیدا ہو جائیں تو زمین و آسمان کا خالق فرماتا ہے کہ ہم تمہیں برباد نہیں کریں گے۔ ایک اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف دل میں پیدا ہو جائے دوسرے برے اعمال پر اللہ کی وعیدوں کا ڈر پیدا ہو جائے۔ ﴿وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيْدِ "اور آباد کریں گے تم کو اِس زمین میں اِن کے پیچھے، یہ ملتا ہے اس کو جو ڈرتا ہے کھڑے ہونے سے میرے سامنے اور ڈرتا ہے میرے عذاب کو وعدہ سے۔" (پ۱۳، ابراہیم،۱۴)﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿اَوامرِ الٰہی کو بجالانے کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ج وَاذْکُرُوا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا ''اور سب مل کر اللہ کی (ہدایت کی رسی) کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دِلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے۔'' (پ۴، آل عمران،۱۰۳)

تمام انسانوں میں جوڑ پیدا کرنے کے لیے روحانیت والا طریقہ اپنانا ضروری ہے انسانی بدن کائنات کی چیزوں سے بنا ہے اس لیے بدن کی غذا کائنات کی چیزیں ہیں اور روح اللہ تعالیٰ کا ایک امر ہے اس کی غذا بھی اَمر خداوندی ہے۔

جس طرح روح نے اعضاء بدن کو جوڑ رکھا ہے اسی طرح اَوامرِ خداوندیؒ کی بجاآوری روحانیت پیدا کرے گی۔ جس طرح

دنیا میں ہر چیز کے جوڑنے کا طریقہ مختلف ہے۔لکڑی کو لکڑی سے جوڑنے کے لیے...... کیل کی ضرورت، کاغذ کو کاغذ سے جوڑنے کے لیے...... گوند کی ضرورت، لوہے کو لوہے سے جوڑنے کے لیے...... ویلڈنگ کی ضرورت، اینٹ کو اینٹ سے جوڑنے کے لیے...... سیمنٹ کی ضرورت اور کپڑے کو کپڑے سے جوڑنے کے لیے...... سوئی دھاگے کی ضرورت پیش آتی ہے۔اسی طرح انسانوں میں باہم جوڑ پیدا کرنے کے لیے حضرت محمد ﷺ کا لایا ہوا طریقہ اپنانے کی ضرورت ہے۔

مگر دین کا درخت بتدریج بار آور ہوگا۔اگر دین کا درخت تیار کرنا ہے...... تو پہلے زمین کو بداخلاقی کے کانٹوں سے صاف کرنا ہوگا...... پھر ایمان کا بیج بونا ہوگا...... پھر خوف کے آنسو بہانے ہوں گے...... پھر اعمال کی شاخیں آئیں گی...... اخلاق کا پھل لگے گا...... اخلاص کا رَس نکلے گا۔ یہ انسان کے لیے سب سے بڑا کمال ہے۔ مکان بنانا کمال نہیں...... کیونکہ کبوتر بھی اپنا گھونسلہ بنالیتا ہے۔تہہ خانہ بنانا کمال نہیں...... کیونکہ چوہا بھی تہہ خانہ میں بل بنالیتا ہے۔ بجلی کی فٹنگ کمال نہیں...... کیونکہ بیا پرندہ بھی اپنے گھونسلہ میں جگنو (چمک دار کیڑا) کو فٹ کر کے روشنی کا انتظام کر لیتا ہے۔ڈاکٹری کر

لینا بھی کمال نہیں...... کیونکہ بندر زہر ملائی ہوئی روٹیاں تریاق والی گھاس کے ساتھ لیتا ہے اور اپنا بچاؤ کر لیتا ہے۔ حکومت کر لینا بھی کمال نہیں ...... کیونکہ شہد کی مکھیاں اپنے حاکم (یعسوب) کے ماتحت اپنا چھتہ منظم طریقے سے بناتی ہیں۔ دُور دُور جا کر مختلف اور قسما قسم کے پھلوں و پھولوں کا رس لاتی ہیں اور غلط قسم کا رس لانے والی مکھی کا سر جلاد حاکم کے حکم سے اڑا دیتا ہے۔ الیکشن لڑنا بھی انسان کا کمال نہیں ...... کیونکہ دو مرغوں کے درمیان لڑائی میں جیتنے والا مرغا فاتحانہ انداز میں آواز بلند کرتا ہے، گردن اونچی کرتا ہے، پَروں کو پھڑ پھڑاتا ہے اور اَکڑ کر چلتا ہے یہ گمان کرتے ہوئے کہ اس گھر کا بڑا میں ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

احساس کمتری سے بچنے کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

وَسِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی جَھَنَّمَ زُمَرًا "اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے گروہ گروہ۔"
وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ زُمَرًا "اور جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ان کی سواریاں گروہ گروہ جنت کی طرف چلائی جائیں گی۔" (پ۲۴، الزمر، ۷۱، ۷۳)

اگر انسان اپنے بارے میں ریسرچ کرے تو اس کا ضعف معلوم ہوکر رجوع الی اللہ نصیب ہوسکتا ہے۔ انسان میں تین کمزوریاں ہیں ایک ضعف بدن ﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا "اور انسان بنا ہے کمزور۔" (پ۵، النساء، ۲۸)﴾ دوم جلد بازی ﴿وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا "اور ہے انسان جلد باز۔" (پ۱۵، بنی اسرائیل، ۱۱)﴾ سوم کم علمی ﴿وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَیْأً وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ

وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ " اور اللہ نے تم کو نکالا تمہارے ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور دیئے تم کو کان اور آنکھیں اور دل تا کہ تم احسان مانو۔" (پ۱۴، النحل، ۷۸) ﴾

دیکھیے! ہم ایک وقت میں ہر جگہ نہیں دیکھ سکتے اگر ایک طرف دیکھیں تو تین جہات سے جاہل ہوں گے اور ہر وقت کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ماضی ہم سے غائب، مستقبل ہم سے غائب، صرف حال کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ بھی غائب ہو کر ماضی بن جاتا ہے۔ مگر اللہ ہر جگہ کو ہر وقت کو دیکھ رہا ہے۔ پھر بعض چیزوں کو ہم بالکل نہیں دیکھ سکتے جیسے روح کو، ہوا کو، آخرت کو ہم نہیں دیکھ سکتے، جبکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں اس لیے خدا تعالیٰ کے بغیر کوئی چارہ نہیں تا کہ وہ ہمیں راستہ دکھا دے اور یہ اس صورت میں ہے کہ ہم ہمہ تن خدا کی اطاعت کریں تا کہ ہماری آخرت بن جائے۔

انسان کو چار منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ (۱) ماں کا پیٹ اور یہ انسان کے اعضاء بننے کی جگہ ہے۔ (۲) دنیا کا پیٹ اور یہ صفات بننے کی جگہ ہے یہاں انسان مسلمان بنتا ہے......عالم بنتا ہے......متقی بنتا ہے۔ (۳) قبر کا پیٹ، ماں کے پیٹ میں جو اعضاء بنتے ہیں وہ یہاں بگڑتے ہیں۔ (۴) آخرت کا پیٹ، دنیا کے پیٹ

میں جو اچھی بری صفات بنتی ہیں آخرت کے پیٹ میں اس کا بدلہ ملتا ہے۔ ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ''اے رب تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن جس میں کچھ شک نہیں بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ۔'' (پ۳، ال عمران، ۹)﴾ اس اجتماع سے نافرمانوں کی جماعتیں بن بن کر جہنم کی طرف جائیں گی۔ ﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾ اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں تاکہ جنت والی جماعتوں میں ہماری تشکیل ہو جائے۔ آمین!

دنیا کی چکا چوند سے دھوکہ نہ کھائیں کیونکہ دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ آج ہماری نظروں میں مچھر کا یہ پَر پڑ چکا ہے اس لیے ہمیں اعمال کی برائی دکھائی نہیں دیتی، جس طرح کسی کے آنکھ میں رائی کا دانہ تو پہاڑ کی مانند بڑے ہیں اور دنیا مچھر کے پر کی مانند چھوٹی ہے۔ ﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ''اب کھول دی ہم نے تجھ پر سے تیری اندھیری سو تیری نگاہ آج تیز ہے۔'' (پ۲٦، ق، ۲۲)﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا عَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

......☆......☆......☆......☆......

﴿اعمالِ صالحہ کی اہمیت﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ شَیْئًا ''مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا اور کی نیکی سو وہ لوگ جائیں گے جنت میں اور اُن کا حق ضایع نہ ہوگا کچھ بھی۔'' (پ١٦، مریم، آیت٦٠)

ٹرین جب اسٹیشن سے روانہ ہونے لگتی ہے تو سیٹی بجاتی ہے اس سیٹی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ آگاہ ہو جائیں۔ اگر کچھ مسافر پلیٹ فارم پر ہوں تو وہ فوراً ڈبے میں آکر بیٹھ جائیں۔ تاہم اس سیٹی کی آواز کو دو زاویوں کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے اگر محض آواز کے معنٰی میں لے کر اس کو شور کہیں تو وہ بالکل غیر مفید اور بے معنٰی معلوم ہوگی لیکن اگر آپ اس کو الارم کہیں تو آپ فوراً اپنے ڈبے کی طرف دوڑ کر سیٹ پر بیٹھ جائیں گے اور سفر طے کر کے اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ادارہ
تالیفات حمیدیہ
فیروزوالا روڈ گوجرانوالہ-پاکستان
0300-6492193